فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی

حضرت مولانا انوار الحق شہودی

فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی

حضرت مولانا انوار الحق شہودی

نام کتاب	:	فوز وفلاح کی گمشدہ کڑی
مصنف	:	حضرت مولانا انوارالحق شہودی
پتہ	:	دائرہ حضرت وصی، شاہ ہارون (برتلہ) سہسرام
اشاعت	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	۱۰۰۰
زیر اہتمام	:	مولانا انوارالحق لائبریری، نیو کریم گنج، گیا
پتہ مرتب	:	حسین الحق، سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا
سرورق	:	امجد حسین، ڈیزائن سنٹر، پٹنہ-۴
کتابت	:	ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ، پٹنہ سٹی
مطبع	:	ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ-۴
ضخامت	:	۱۳۲
ناشر	:	انجینئر شارع علی حق
قیمت	:	۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

- ☆ قاضی علی حق اکیڈمی، دائرہ حضرت وصی، شاہ ہارون، سہسرام
- ☆ ارم پبلیشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴
- ☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴

ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد کا مطالعہ
اور ناکامی کے بنیادی سبب کی تلاش

حضرت مولانا انوار الحق شہودی

فوز و فلاح کی گم شدہ کڑی

جد و جہد نبویؐ کے پس منظر میں
ہندوستانی مسلمانوں کی جد و جہد کا مطالعہ
اور ناکامی کے بنیادی سبب کی تلاش

حضرت مولانا انوار الحق شہودی

نام کتاب	[illegible]
مصنف	[illegible]
طبع	[illegible]
اشاعت	[illegible]
تعداد	[illegible]
زیر اہتمام	[illegible]
پیش لفظ	[illegible]
سرورق	[illegible]
کتابت	[illegible]
طباعت	[illegible]
ناشر	[illegible]
قیمت	[illegible]

[illegible]

انتساب[1]

ذی الحجہ کی ۱۴ تاریخ کی بات ہے—

کی سب سے حسین اور قیمتی پونجی قضاوقدر کے ہاتھوں لٹ چکی تھی اور جی بہلاؤ کے تمام نازک تار ٹوٹ چکے تھے۔ گورستان کے پرسکون پہلو ی تب کے تین ننھوں اور منیھی توبجی حضاوقدر رے ہاسوں تٹ چی کی ور جی بہلاؤ کے تمام نازک تار ٹوٹ چکے تھے۔ گورستان کے پرسکون پہلو میں ہمناوتں ی ییق مٹھی ی زبوں کا سشور...... تھ وبابرکی پاروں ں بجے باک کوند میں مبہوت راہی کی طرح سسک رہا تھا...... اور ساری کائنات نیند کے جھولوں میں میٹھی نیند کا مزا لے رہی تھی ...... کہ اچانک وارفتگی میں ٹکراتی ہوئی ہوائی موجوں پر...... اصدق ...... کی پرمحبت آواز نے چونکا دیا "ابا...... اٹھیے!"

یہی ہے وہ شانِ اضطراب

جو زیرِ نظر کتاب کی شانِ نزول کے مترادف ہے۔

۱۔ کتاب کے پہلے صفحے پر حضرتؒ مصنف کی تحریر کی نقل

اشاریہ

پیش لفظ

حضرت مولانا انوارالحق شہودی نازش سہسرامی کی تقریباً ایک درجن غیر مطبوعہ نثری کتابوں میں سے یہ ایک کتاب قارئین کے سامنے پیش کرنے کی راقم الحروف سعادت حاصل کر رہا ہے۔

حضرت نازش کا پہلا شعری مجموعہ ''حرف تمنا'' حضرت کی زندگی ہی میں بہار اردو اکادمی سے اشاعت کے لئے منظور ہو چکا تھا مگر مشیت ایزدی کہ یہ مجموعہ ۱۹۸۳ء اشاعت حضرت کے عرس چہلم کے بعد ۱۹۸۴ء میں ممکن ہو سکی۔

حضرت کا دوسرا شعری مجموعہ ''حریم شوق'' ۱۹۹۶ء میں اشاعت پذیر ہو سکا۔
ان دو شعری مجموعوں کے علاوہ چار نثری کتابیں (۱) وحدت الہ (۲) شرف آدم کا نقطہ عروج (۳) تصوف و رہبانیت کی حقیقت اور (۴) اسلام کا روحانی نظام بھی منظر عام پر
ان دو شعری مجموعوں کے علاوہ چار نثری کتابیں (۱) وحدت الہ (۲) شرف آدم کا نقطہ
ان چھ کتابوں کے علاوہ (۱) ''قطعات نازش'' پریس میں ہے (۲) منظومات آ چکی ہیں۔

ان چھ کتابوں کے علاوہ (۱) ''قطعات نازش'' پریس میں ہے (۲) منظومات نازش کی ترتیب و تدوین کا کام چل رہا ہے۔

گویا مجموعی طور پر حضرت مولانا شہودی کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکیں، دو

کتابیں یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آنے والی ہیں اور یہ نویں کتاب اربابِ علم وادب کی جناب میں تعینِ قدر کی خاطر حاضر ہے۔

دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ مگر ہمارے صوبہ کے بزرگوں کا جو ایک عام مزاج گوشہ نشینی، بے نیازی اور خود کو خود سے نمایاں نہ کرنے کا رہا ہے۔ حضرت مولانا بھی اسی ایک عملی زندگی گزاری اور میدان عمل میں سرگرم مجاہد کو ہر دور میں اشاعت کی طرف سے بے نیاز ہونا پڑتا رہا ہے۔

شخصیت:

صورت حال مجموعی طور پر یہ رہی کہ حضرت مولانا انوار الحق شہودی تا عمر اپنے عصر کی مذہبی، علمی، ادبی، صوفیانہ، خطیبانہ اور غیر فرقہ وارانہ سیاسی روایت کا حصہ رہے۔ یعنی وہ اپنے عصر اور ہم عصروں میں ایک معتبر عالم دین کی حیثیت سے ہمیشہ "مرجع طالبان علم دین" رہے۔ اسی ضمن میں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ وہ مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام جیسے اپنے زمانے کے معتبر علمی ادارے میں بحیثیت مدرس علوم دینیہ تا عمر درس و تدریس کی مسند پر جلوہ افروز رہے۔ ادبی لحاظ سے وہ نثر نگار اور شاعر دونوں حیثیت سے اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتے تھے۔ نتیجتاً خصوصی طور پر سہسرام اور

مجموعی طور پر بہار کے اہل علم حلقے میں ان کا ایک مخصوص مقام رہا۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ سلسلہ چشتیہ کی مسند سجادگی پر جلوہ افروز نظر آئیں گے اور خطیبانہ مصروفیتوں پر غور کیجئے تو دھنباد سے بنارس تک اجلاس سیرت کے درجنوں ایسے اشتہارات و اعلانات ملیں گے جن میں حضرت کا نام نامی نمایاں نظر آئے گا، اور آزادی سے پہلے کی جمعیۃ العلماء کی فائل دیکھئے تو حضرت مولانا شہودی ضلع شاہ آباد کی نظامت فرماتے نظر آئیں گے۔

اور چونکہ مولانا شہودی مذکورہ بالا متعدد محاذوں پر بیک وقت متحرک تھے۔ اس لئے عملی اقدام کے تواتر اور کثرت نے تحریری تو نہیں لیکن اشاعتی تسلسل میں کچھ روڑے ضرور اٹکائے، اس کے باوجود متعدد جرائد مثلاً ''مدینہ'' (بجنور)، ''سیرت'' (بنارس)، ''الجمعیت'' (دہلی)، ''المجیب'' (پھلواری شریف)، ''اشرفیہ'' (مبارک پور)، ''رفاقت'' (پٹنہ)، ''صبح نو'' (پٹنہ)، ''مفکر'' (سہسرام)، ''سہسرام ایکسپریس'' (سہسرام) اور ''حق پسند'' (سہسرام) وغیرہ اخبارات و رسائل میں حضرت کے مضامین کی اشاعت کا سراغ ملتا ہے۔

ماحول:

حضرت کے اساتذہ میں حضرت کے والد و مرشد حافظ طریقت حضرت شاہ وصی الحق مسکین اصدقی کے علاوہ حضرت مولانا مشتاق احمد کان پوری، حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادی، صدرالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین، شیخ الحدیث حضرت مولانا وصی احمد سہرامی، حضرت مولانا فرخند علی سہرامی اور حضرت مولانا قمرالدین مجیبی پھلواروی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حضرت کے تلامذہ میں جناب ڈاکٹر اظہار الحق آصف سہرامی، مولانا شاہ

نواز احمد خاں ایم اے (ڈپٹی کمشنر، لیبر ڈپارٹمنٹ، جھارکھنڈ)، جناب نہال الدین احمد (چیرمین سنی وقف بورڈ، بہار)، مولانا جلال الدین اوج اکبرپوری، مولانا مقیم شاد مونگیری، سرتاج علی خاں ایڈوکیٹ (امیر مونس، ضلع گیا)، عبدالرب نشتر ایڈوکیٹ، پروفیسر شیم ہاشمی (ڈی اے وی کالج، بوکارو)، مولانا سراج الدین فریدی، ڈاکٹر عین تابش، ڈاکٹر زین رامش، اور حسین الحق کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت کے احباب میں مولانا سید احمد عروج قادری، حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری، جناب مہجور شمسی، جناب کیف سہسرامی، جناب ناظم میواتی اور جناب حضرت شاہ مشہود اصدق وغیرہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ پروفیسر صفدر امام، جناب تفضل حسین ایڈوکیٹ، جناب اشرف حسین، جناب سید نعیم الحق مسرور اور جناب سید نسیم الدین احمد صاحبان سے بالکل ہی نجی اور قرابت قریبہ کے تعلقات تھے۔

حضرت کی حیات میں جن حضرات سے مولانا شہودی کی مراسلت کا سراغ ملتا ہے ان میں حضرت مولانا سلیمان ندوی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری، حضرت شاہ مشہود اصدق، حضرت سید احمد حسین قادری مجیبی (مدیر المجیب، پھلواری شریف)، جناب پروفیسر صفدر امام (ملتان) جناب مہجور شمسی، عنایت الرحمٰن صاحب جج (مشہور ادیب شکیل الرحمٰن صاحب کے بڑے بھائی)، جناب پروفیسر ڈاکٹر مطیع الرحمٰن (سابق صدر شعبہ اردو، متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ)، جناب مولانا رکن الدین اصدق اور ماموں جان جناب سید نسیم الدین احمد بے ساختہ یاد آرہے ہیں۔

انتقال کے بعد:

حضرت نازش کے انتقال کی خبر ''اخبار مشرق''، ''اقراء'' (کلکتہ)، ''ہماری

زبان"، "کتاب نما"، "قومی آواز"، "نیشنل ایکتا" (دہلی)، "سنگم"، "صدائے عام"، "قومی آواز" (پٹنہ)، "سیاست" (کانپور)، "ایک قدم" (پٹنہ) اور "مورچہ" (گیا) میں جلی سرخیوں میں شائع ہوئی۔

حضرت کے انتقال پر خصوصی طور پر سہسرام اور عمومی طور پر بہار کے بڑے حصے میں حزن وافسوس کا ماحول پیدا ہوا، جنازے کے سفر میں بھیڑ کا یہ عالم رہا کہ ٹریفک جام ہو گیا۔ کم وبیش ہزاروں افراد نے حضرت مولانا کی آخری زیارت کی۔

حضرت مولانا شہودی کے انتقال پر سہسرام، تلوتھو، ڈہری، اورنگ آباد، شیر گھاٹی، گیا، نوادہ، بہار شریف، پٹنہ، مرلی گنج، دھنباد وغیرہ مختلف علاقوں میں متعدد تعزیتی نشستیں منعقد ہوئیں جن میں بڑی تعداد میں علماء، ادباء اور شعراء نے اپنے رنج وغم کا اظہار کیا اور حضرت کے فضل وکمال کا اعتراف کیا۔ ان تعزیتی نشستوں کے انعقاد کی خبریں ملک کے متعدد اخبارات میں ۱۹۸۴ جنوری سے ۱۹۸۴ء مارچ کے درمیان لگاتار شائع ہوتی رہیں۔

حضرت مولانا کے انتقال پر بہ نفس نفیس تشریف لانے والے سیکڑوں افراد میں حضرت شاہ مشہود اصدق (سجادہ نشیں خانقاہ اصدقیہ، پیر بیگھہ شریف)، حضرت مولانا شاہ رضوان احمد مرحوم (سجادہ نشیں، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف)، حضرت مولانا احتشام الدین فریدی (سجادہ نشیں خانقاہ فریدیہ، سہسرام)، حضرت مولانا رکن الدین اصدق (مہتمم مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف، بہار شریف)، جناب شاہ مشہود الحق (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج، بہار)، نہال الدین احمد (چیرمین سنی وقف بورڈ)، ڈاکٹر علی امام (پرنسپل ڈی آئی ای ٹی، بکرم، بہار)، ڈاکٹر حسین احمد (صدر، شعبہ اردو، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ)، مشتاق الدین فریدی (چیف فنانس ایڈوائزر، او این جی سی، حکومت ہند)، پروفیسر قاسم فریدی (شعبہ اردو سنہا کالج، اورنگ آباد) وغیرہ کا ذکر ضروری ہے۔

بہ نفس نفیس تشریف لانے والے کرم فرماؤں کے علاوہ حضرت سید شاہ عون احمد قادری (نائب صدر جمعیۃ العلماء ہند)، حضرت ڈاکٹر عنوان چشتی (سجادہ نشیں خانقاہ شاہ ولایت، منگلور و سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)، حضرت مولانا سید شاہ پروفیسر طلحہ رضوی برق (سجادہ نشیں خانقاہ چشتیہ، داناپور)، حضرت ڈاکٹر اکمل اجملی (سجادہ نشیں دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد)، حضرت مولانا رکن الدین اصدق، پروفیسر حفیظ بنارسی، پروفیسر شعیب راہی، پروفیسر ابوذر عثمانی (سابق صدر شعبہ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ)، پروفیسر مطیع الرحمٰن (سابق صدر اردو، متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ)، جناب احمد یوسف، جناب ظہیر صدیقی، جناب پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر سراج اجملی، سید احسن الدین احمد (ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر کمرشیل ٹیکسز)، جناب مقیم شاد، جناب شوکت حیات، جناب ڈاکٹر نصر امام (امریکہ)، ڈاکٹر علی امام، اور جناب سید طارق محمد مرحوم (اجمیر شریف) وغیرہ کے علاوہ تقریباً سیکڑوں افراد نے اس حادثہ فاجعہ پر تحریری طور پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

مختلف تعزیتی نشستوں میں جناب کیف سہسرامی، جناب ناظم میواتی، جناب طلحہ رضوی برق، جناب نعیم الحق مسرور، جناب ظفر رضوی، جناب کیف عظیم آبادی، جناب ناوک حمزہ پوری، جناب مقیم شاد، جناب شجر ٹکاروی، جناب آصف سہسرامی، جناب مولانا رکن الدین اصدق، جناب زکریا مضطر، جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام، جناب ڈاکٹر اکرام الدین شمسی (لکچرر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی)، جناب شاہین سہسرامی، جناب شہود ثمر، جناب قاسم فریدی، پروفیسر ریاض نیر، جناب حکیم انیس الزماں وغیرہ نے حضرت مولانا شہودی کو نثر و نظم میں خراج عقیدت پیش کیا۔

حضرت مولانا انوار الحق شہودی نازش سہسرامی کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر محفوظ الحسن، ڈاکٹر شاہد احمد شعیب، ڈاکٹر محمد ثنیٰ

رضوی، ڈاکٹر ش اختر، ڈاکٹر افصح ظفر، ڈاکٹر غنی حیدر ذکریا، ڈاکٹر شفق، ڈاکٹر حضرت شاہ طیب ابدالی، مولانا حاذق ضیائی، پروفیسر شمیم ہاشمی، ڈاکٹر اسلام عشرت، ڈاکٹر قاسم فریدی اور ڈاکٹر مظفر عالی وغیرہ تفصیلی طور پر لکھ چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر زین رامش کے ذریعہ حضرت کی غزل گوئی پر اور ڈاکٹر مشیر الزماں کے ذریعہ حضرت کی نثر نگاری پر پی ایچ ڈی کے لئے نصابی تحقیقی کام بھی مکمل ہو چکا۔ مزید براں یہ کہ پہلا مجموعہ کلام ''حرف تمنا'' مگدھ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کے نصاب میں شامل رہا اور حرف تمنا کی روشنی میں حضرت نازش کے فن پر عین تابش کا تنقیدی مطالعہ بھی ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آ چکا۔

مذکورہ بالا پس منظر بیان کرنے کا واحد مقصد یہ دکھانا ہے کہ جس شخصیت کی تحریر حاضر خدمت ہے یہ شخصیت مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی، صوفیانہ اور خطیبانہ لحاظ سے اتنی ناگزیر تھی کہ اس شخصیت کے انتقال سے مذہبی، علمی، ادبی اور صوفی سماج نے ارتح کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

فن پر گفتگو:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ حضرت مولانا کی چار نثری کتابیں (۱) وحدت الہ (۲) شرف آدم کا نقطہ عروج اور (۳) تصوف و رہبانیت کی حقیقت اور اسلام کا روحانی نظام شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان چاروں کتابوں میں وحدت الہ تو اپنے عنوان ہی سے یہ واضح کر رہی ہے کہ اس میں توحید پر گفتگو ہے۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ قابل ذکر ہے کہ یہ ساری گفتگو قرآن کریم کے حوالے سے ہے اور قرآن کریم میں

وحدت الہ کے بارے میں جو ہدایتیں اور وعیدیں آئی ہیں اسی پس منظر میں حضرت مصنف نے توحید پر گفتگو کی ہے۔

دوسری کتاب ''شرف آدم کا نقطہ عروج'' دراصل مذہبی فکر کا فلسفیانہ اظہار ہے اور اس کتاب کا مرکزی نکتہ یا مرکزی خیال یہ ہے کہ شرف آدم کا نقطہ عروج یہ ہے کہ انسان کا ''قلب سلیم'' بیدار ہو جائے، اس سلسلے میں حسب ذیل عنوانات کے تحت حضرت مصنف نے اپنی گفتگو آگے بڑھائی ہے:

عنوانات ملاحظہ ہوں:

(۱) حرف اول
(۲) تحقیق کی کم مایگی
(۳) کائنات امر الٰہی
(۴) جوہر نمو کی پہلی انگڑائی
(۵) نمود کائنات کا اصلی محرک
(۶) تخلیق کا پہلا لمحہ
(۷) آدم یا انسانِ اول
(۸) سرگزشت آدم کا دوسرا ورق
(۹) جنتِ آدم
(۱۰) شجرِ ممنوعہ
(۱۱) انسان کے فطری تقاضے
(۱۲) شعورِ ذات
(۱۳) معراجِ انسانی کی روشن منزل
(۱۴) اسمِ اعظم
(۱۵) حرفِ آخر

میں سمجھتا ہوں یہ عنوانات کتاب کے مباحث کے بارے میں کچھ نہ کچھ اشارہ تو ضرور ہی کر رہے ہیں۔ فی الحال میں اس کتاب پر مزید گفتگو غیر ضروری سمجھتے ہوئے تیسری کتاب ''تصوف و رہبانیت کی حقیقت'' کے عنوانات درج دفتر کر رہا ہوں۔

(۱) پیش لفظ
(۲) لفظ تصوف کی اصل
(۳) تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ
(۴) کیا موجودہ اصطلاح تصوف متاخرین کی ایجاد ہے
(۵) تصوف اور دیگر مکاتب فکر
(۶) تصوف ـــ دین ابراہیمی کا نقطہ ارتکاز
(۷) اسلامی تصوف
(۸) تصوف کا مفہوم و ماحصل
(۹) مختلف صوفیانہ تصورات و معتقدات کی حقیقت
(۱۰) قرآن کریم میں اللہ والوں کا تذکرہ
(۱۱) زبان نبوتؐ سے تصوف کی جانب ایک اشارہ
(۱۲) تصوف کا بنیادی منصب
(۱۳) غلط فہمیوں کے اسباب
(۱۴) صحیح صورت حال
(۱۵) مادیت و روحانیت کا مسئلہ
(۱۶) متقدمین کی امتزاجی صفات
(۱۷) غیر اسلامی اقتدار کے اثرات
(۱۸) اندھیریوں میں ایک چراغ

اور اب زیر مطالعہ کتاب کے چند عنوانات ذہن میں لائیے جو کچھ یوں ہیں:

(۱) آغاز اسلام اور مصائب کی ہول ناکیاں
(۲) مخالفت نبوتؐ کے لئے اجتماعی عملی اقدام
(۳) ہلاکت آفریں مہمہ شدید (مقاطعہ)
(۴) شعب ابی طالب
(۵) ہجرت اولیٰ
(۶) ہندوستانی تصور الوہیت
(۷) گوتم بدھ کا تزکیہ نفس
(۸) مجوسی تصور الوہیت
(۹) اہل کتاب اور دینِ ابراہیم
(۱۰) ملت ابراہیمی اور دینِ حق

کیا آپ کو ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ حضرت مصنف کی فکر تاریخ، فلسفہ (یا دانش)، اور مذہب کی سہ رخی فری کوئنسی پر گھومتی رہتی ہے؟

تو گویا موضوع کی سطح پر حضرت مولانا انوار الحق تاریخ فلسفہ اور مذہب کو اپنے Source material کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی تحریروں کا موڈ بھی تاریخی، دانش ورانہ اور مذہبی ہوتا ہے۔

اور جہاں تک اسلوب کی بات ہے تو مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابوالکلامی نثر سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں۔ نتیجتاً مولانا شہودی کو اگر اسلوب آزاد کی توسیع کہا جائے تو شاید یہ بات غلط نہ ہوگی۔ البتہ موضوع کے لحاظ سے جب وہ شعوری طور پر سنبھل کر لکھتے ہیں تو شبلی نعمانی اور رشید احمد صدیقی کا ''آمیزہ'' سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔

اس مختصر خیالی کو ذرا بالتفصیل بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔ اور اس

تفصیل کی خاطر میں انہی تینوں کتابوں سے ایک ایک اقتباس پیش کروں گا۔

(۱) کسی انسان سے جب وہ خارجی موثرات سے خالی الذہن ہو تو پوچھئے، وہ فطری تقاضوں کا بہ ہزار غلط بینی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ جس طرح سونا آگ میں اور انسان ہجوم مصائب میں نکھرتا ہے۔ فطرت انسانی کے بعد آدم اس منزل سے روشناس ہوئے جسے ہم "لغزش قدم" بھی کہہ سکتے ہیں اور شعور ذات بھی۔ تکمیل کا جادو دراصل اسی میں سمویا ہوتا ہے۔ مذہب و سیاست کی معلمانہ کارگزاریاں ان تقاضوں پر بقدر بلوغ صرف نظر کرتی ہیں اور قانون تہذیب نفس کے نام پر اہتمامِ ترتیب وتہذیب کرتا ہے، یہ عمل سوئے ہوئے جذبے کو جگانے کے مترادف بھی ہے، اور جذبہ بیدار کی ترتیب وتہذیب کی کوشش بھی۔

گناہ وثواب کی دنیا اسی رنگ و بو سے بسی ہے۔ اور اگر یہ معمہ حل ہو جائے تو انسان جینے کے بجائے مرنے کی دعائیں مانگا کرے۔ فطری شریعت کا یہ ہمہ گیر قانون ہر رنگ ولباس میں نمو آثار ہے۔ انسان ہشیار ہو یا بے خود اس قانون کی داروگیر سے بچ نہیں سکتا۔ البتہ شعور ذات کی رہنمائیوں سے اگر محروم نہیں ہے تو دیوانگی اور بے راہ روی کے ہاتھوں دامن تار تار نہیں ہوگا۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ فطرت انسانی کا حقیقی تاثر دیوانگی پسند (منفی) ہے یا ہشیاری (مثبت) کی طرف مائل ہے۔ میں نے جب جب اس مسئلے پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت دراصل انسانی

فطرت کے سلیم تقاضوں کو حاصل ہے۔

(شرف آدم کا نقطۂ عروج، ص ۴۸-۴۷، مطبوعہ ۱۹۸۹ء)

(۲) اسلامی نظام حیات کا کوئی شعبہ اور قوانین شریعت کا کوئی گوشہ، مسلمانوں کی دینوی زندگی کا کوئی زاویہ اور امت کی دینی وروحانی حیات کا کوئی دائرہ اگر قرآنی معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس کا حقیقی ماخذ ومنبع کتاب و سنت نہیں تو ہرگز ہرگز اسے اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی الٰہی تعلیم ودعوت سے کوئی رابطہ اور علاقہ نہ ہوگا۔ دراصل پیروان اسلام کا یہی وہ بابرکت اور دینی سرمایہ ہے جس کا اتلاف وضیاع کتاب وسنت کے بلند مقاصد ومحاسن کا اتلاف وضیاع ہے اور اس کا تحفظ اور اس کے ایک ایک زریں اصول کی بقا وقیام دین متین کے قصرِ ہدایت کا استحکام ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد امت اور امراء امت اگر اس قیمتی سرمایہ ہدایت وسعادت کو قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی منشائے مبارکہ کے مطابق اپنی عملی زندگی میں دستور واساس بنا کر اس پر کاربند رہتے تو کون ہے جو اس سے انکار کرنے کی جرأت وہمت کرے کہ امت کی دینی ودینوی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ وہی معراج کمال حاصل ہوتی جو خود عہد نبوت اور خلافت راشدہ میں حاصل تھی اور امت کے درمیان وہ ہولناک فتنے بھی سر نہ اٹھاتے جن کی خوں آشام لہروں نے قوائے ملت کے متعدد گوشہ ہائے اعتقاد واعمال کو مسموم سست اور مضمحل کر دیا۔

(تصوف ورہبانیت کی حقیقت، ص ۴۳)

(۳) "آفتاب کا طلوع وغروب، روز وشب کا سلسلہ لامتناہی، تاروں کا چمک چمک کر ڈوب جانا، چاند کی صاف وشفاف کرنوں سے باغ و

بہاراں کے حسن اور جلوہ دل آویزی کا نکھار، پہاڑوں کا ڈراؤنا پیچ وخم، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کا دفعتاً ابھرنا اور خس و خاشاک کو بے رحم قزاق (یا مہربان نظافت پسند) کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ کر بہالے جانا اور اس قسم کے متعدد نو موجود حادثات کا نومولود انسان کی دنیا میں خود بخود صادر ہونا اور خود ہی محو ہو جانا۔ نوع انسانی کی حسِ اجتماعی کے لئے ایک سامان عبرت تھا کیوں کہ ابھی ابھی جس قافلہ وجود نے گہوارہ فطرت میں آنکھیں کھولی تھیں اس کے اردگرد ایک ایسی پراسرار فضا ہالہ بنائے ہوئی تھی جس کے حصار سے بچ نکلنا اور جس سے انحراف و بے رخی برتنا ناممکن تھا۔ مظاہر فطرت کی اسی حکمرانی میں انسان کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نجات نہیں تھی کہ وہ بغیر کسی کامل ترین فہم و شعور کے ان قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اسی لئے اس نے کبھی آفتاب کے آگے عقیدت کے پھول پیش کئے اور کبھی چاند تاروں کو معبود بنا کر تسکین حاصل کی۔ اس طرح مظاہر فطرت کی گوناگوں رنگینیوں نے انگنت خداؤں کی دنیا پیدا کر دی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ابناء جنس یا نوع انسانی کے اسی غلط جذبہ عبودیت اور اپنے زمانے کے غلط اعتقادی اختیارات کو تجزیہ و تحلیل کی روشنی میں حل فرمایا جسے قرآن کریم نے: حضرت ابراہیم کو ''زمین و آسمان کی بادشاہت دکھانے سے تعبیر کیا ہے۔''

(''فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی''۔۔۔ ص۸۹)

مذکورہ بالا تین اقتباسات تین کتابوں سے پیش کیے گئے جن میں پہلی کتاب مذہبی فکر کا دانش ورانہ اظہار کرتی ہے، دوسری کتاب خالصتاً تصوف کے مسائل پر گفتگو کرتی ہے اور تیسری کتاب کا منشاء یہ ہے کہ جدوجہد نبویؐ کے پس منظر میں تاریخی طور پر مسلمانوں اور اسلام کا جائزہ لیا جائے۔

اس طرح یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تینوں کتابوں کے موضوعات الگ الگ ہیں اور موضوعات کا یہ تنوع تینوں کتابوں کے اسالیب میں تنوع اور اختلاف کا لازماً متقاضی ہے اور یہ تنوع جگہ جگہ اپنے ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ مثلاً تینوں اقتباسات کی شروع کی تین تین سطریں تقابلی طور پر زیر مطالعہ لائیں تو احساس ہوگا کہ پہلے اقتباس میں مدلل ہونے کی خواہش نمایاں ہے، دوسرے میں بیان کے متشرع ہونے کا جذبہ نمایاں ہے اور تیسرے اقتباس میں مترادفات کا تواتر وہ خطیبانہ انداز پیدا کر رہا ہے جو بالعموم مولانا آزاد کا اختصاص رہا ہے۔

اسی لئے میں نے سطور ماقبل میں عرض کیا کہ مولانا شہودی موضوعاتی تقاضوں کے پیش نظر شعوری طور پر اپنا اسلوب بدلتے بھی نظر آتے ہیں۔

لیکن چونکہ اسلوب کا معاملہ شعوری سے زیادہ لاشعوری ہے اس لئے حضرت مصنف بھی شعوری طور پر چوکنا ہونے کے باوجود مولانا آزاد سے تاثر قبول کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے اسلوب کا جو under current ہے وہ ابوالکلامی اسلوب سے متاثر ہو یا نہ ہو، ''پرشکوہ اسلوب'' اور ''اسلوب جلیل'' سے متاثر ضرور نظر آتا ہے۔

اس پرشکوہ اسلوب پر علی گڑھ تحریک، اور پھر خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے عہد شباب میں کافی حملے اور اعتراضات ہوئے۔ سادہ بیانی کی ہوا بہہ رہی تھی۔ نتیجتاً باوقار پرشکوہ اعلیٰ علمی اسلوب کو اردو کی پوری نثری روایت سے الگ کر کے دکھانے کی کوشش بھی ہوتی رہی۔ مگر اب جب کہ بہت سی افواہوں کا جادو اتر رہا ہے اس مسئلے پر بھی ہمدردی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ابوالکلامی اسلوب، یا اسلوب جلیل کی روایت کا تسلسل ہماری زبان میں ہے یا نہیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اردو کی ابتداء سے عہد نازش تک کی نثر کا ایک سروے ضرور کیا جائے۔

میں اردو نثر کی ابتدا کی بات شیخ برہان الدین جانم سے شروع کرنا چاہتا ہوں

جن کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) میرانجی شمس العشاق کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے صوفیائے کرام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جانم نے اپنے والد کی روایت کو قائم رکھا اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ میں مستر دکر دیتا ہے۔ ''کلمۃ الحقائق'' جانم کی نثری تصنیف ہے۔...... کلمۃ الحقائق کے اسلوب کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں ہندوی و فارسی طرز احساس کی کشمکش زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ فارسی اسلوب و آہنگ غالب آنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس لیجیے:

''یوں بندہ خدا تھے تو فعل تیرے وہ بھی خدا تھے جسے تیری طاقت میں آوتا و کار کمال قدرت غالب تھی۔ خداست ونہ بینی کہ

یہ رنگ بیان ''کلمۃ الحقائق'' میں عام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا نثری اسلوب فارسی کے سہارے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔''[۱]

یہی صورت حال ان کے دوسرے رسالے ''رسالہ وجودیہ'' میں نظر آتی ہے۔ حضرت جانم کے بعد یہ روایت ان کے ایک خلیفہ شیخ محمود الحق خوش دہاں کے یہاں آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ خوش دہاں کی تاریخ وفات قدیم تذکروں میں ۱۶۳۵ء

[۱] تاریخ ادب اردو جلد اول۔ جمیل جالبی ص ۲۱۱-۲۰۲۔

درج ہے۔ (''سب رس'' کا زمانہ تصنیف بھی ۱۶۳۵ء ہی ہے) خوش دہاں کے بارے میں ''تذکرہ اولیائے دکن'' سے اطلاع ملتی ہے کہ:

''خوش دہاں بیجاپور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تعلیم و تربیت بیدر میں ان کے نانا شاہ حبیب اللہ کے ہاتھوں ہوئی۔ اسی وجہ سے ان کے اظہار بیان پر بیجاپوری اثرات کم اور فارسی اسلوب کا اثر زیادہ ہے۔ تعلیم و تربیت کے بعد خوش دہاں بیجاپور چلے آئے اور جانم سے سلسلہ چشت میں بیعت کی۔ شاہ جانم کی وصیت کے مطابق خوش دہاں ان کے بیٹے امین الدین اعلیٰ کے پیر تربیت اور اتالیق مقرر ہوئے۔''[۱]

شاہ جانم کی تعلیمات کو فروغ دینے کے سلسلے میں خوش دہاں نے ایک ''اردو رسالہ تصوف'' ترتیب دیا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اول ذکر جلی اللہ کا ناؤں ظاہر کے اعضاء سوں۔ ذکر باطن کی زبان سوں ہمیشہ بعد ازاں۔ ذکر روحی مشاہدہ اس طریق سوں۔ اول مرشد کی صورت دل میں مقابلہ پکڑنا۔ اس صورت کوں دیکھنا، سو روح کا نظر ہے۔ اس دل میں یوں بولنا کہ صورت کو دیکھنا سو کون، کیا نظر پاک ہے۔ عجب لطیف بعد ازاں اس صورت پرتے نظر ثابت کرنا، علاوہ نظر معلق رکھنا، چندروز اس کا کثرت کرنا تا نظر کہے کہ میں علیحدہ نظر ہوں، ظاہر باطن یک ہوئے۔''[۲]

اس نثر کے بارے میں جمیل جالبی صاحب کا خیال ہے کہ:

''یہاں نثر میں ایک ترتیب ایک باضابطگی، ایک تسلسل اور ایک ربط کا احساس ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نثر نے کسی حد تک اپنا راستہ مقرر کرلیا ہے

---

[۱] تذکرہ اولائے دکن حصہ اول جلد سوم ص ۷۹۵ اور اولیائے بیجاپور۔ ص ۱۲۴

[۲] رسالہ محمود خوش دہاں۔ مرتب حمید الدین شاہد ص ۳۱۔ مطبوعہ ایوان اردو، کراچی ۱۹۷۰ء

اور فارسی اسلوب نے اسے ایک "نیا رنگ وروپ" دے دیا ہے۔"[1]

گو کہ خوش دہاں کے بعد جمیل جالبی نے امین الدین اعلیٰ کے رسالہ وجودیہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن تاریخی طور پر اب ہم سب رس کے قریب آ چکے ہیں اس لئے رسالہ وجودیہ کے ذکر کو درج دفتر کرتے ہوئے میں سب رس کی طرف متوجہ ہونا زیادہ صائب سمجھتا ہوں۔

سب رس کا زمانہ تصنیف ۱۶۳۵ء ہے۔ یہ زمانہ عبداللہ قطب شاہ، بادشاہ دکن کا ہے۔ "سب رس" کے مصنف ملاوجہی اردو نثر کے پہلے مکمل تمثیل نگار ہیں، پہلے باضابطہ قصہ گو ہیں، اردو کی باضابطہ اور پہلی مکمل کتاب کے مصنف ہیں اور سب رس اردو کی پہلی مکمل صوفیانہ تمثیل ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ قصہ طبع زاد نہیں پھر بھی ملاوجہی نے جس خوبصورتی کے ساتھ اس کو اردو میں منتقل کیا اس فنکاری نے اس کو مستقل تصنیف کا درجہ عطا کر دیا ہے، اور سطور بالا میں "کلمۃ الحقائق"، رسالہ "خوش دہاں" اور "رسالہ وجودیہ" کے حوالے سے جس "مفرس نثر" کے عروج کی طرف اشارے کئے گئے اس کی بھرپور شکل "سب رس" میں نظر آتی ہے۔ مثلاً:

(۱) تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھا ہے کریم۔

(۲) ناموس بولیا کہ اس تازہ آب حیات کا قصہ ایک تاویل دھرتا ہے۔

(۳) جس کوں خدا دیا امان، جس کوں خدا کا دھیان، جس کوں خدا کی پیچان، جس کا روشن ایمان۔

---

[1] تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۳۰۸۔

(۴) صباح کے وقت، بیٹھے تخت، یکایک غیب تے رمز پاکر، دل میں اپنے کچھ لیا کر، وجہی نادرفن کوں، دریادل گو ہر سخن کوں، حضور بلائے، پان دیئے، بہوت مان دیئے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجودچ میں کچھ عشق کا بیان کرنا، کچھ نشان دھرنا۔ وجہی ...... بہت بڑی فکر کریا، بلند ہمتی کے بادل تے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوئی کہ اب اردو نثر باضابطہ فارسی سے اثرانداز ہو چکی۔ دوسری خاص بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیۓ کہ سب رس کے ذریعہ اردو نثر کا ایک "ادبی اسلوب" بھی نکھرتا نظر آتا ہے۔

"سب رس" کے بعد وجہی کی "ترجمے کی روایت" اور زور پکڑتی ہے اور ترجمے کے ذریعہ فارسی اقدار وافکار ہندوستان سے متعارف ہوتے گئے اور اردو ادب میں بھی جگہ بناتے گئے۔ خاص طور پر صوفیانہ خیالات کا وفور انہی اثرات کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً میرانجی حسین خدانما کو لیجیئے جو ملاوجہی کے فوراً بعد کی شخصیت ہیں۔ ان کی کتاب "چہار وجود" میں حضرت برہان الدین جانم اور حضرت امین الدین اعلیٰ کے صوفیانہ خیالات وتصورات اور رویوں کی تشریح سوال جواب کے پیرائے میں کی گئی ہے۔

سائل سوال کرتا ہے کہ "چہار وجود" کیا ہیں۔ جواب دیا جاتا ہے کہ:

"واجب الوجود میں چہار وجود ہے۔ یعنی واجب کا واجب الوجود۔ ہور واجب کا ممکن الوجود ہور واجب کا ممتنع الوجود، ہور واجب کا عارض الوجود۔ ہور "چہار وجودِ ممکن" کا واجب الوجود، ہور ممکن کا ممتنع الوجود، ہور ممکن کا ممکن الوجود ہور عارض الوجود۔"[1]

---

[1] چہار وجود۔ قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان

ترجمے کے ضمن میں ''شرح تمہیدات ہمدانی'' سے گفتگو شروع کی جا سکتی ہے۔ جس کا فارسی ترجمہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے فرمایا اور پھر فارسی سے اسے اردو میں حضرت حسین خدانما نے منتقل کیا۔ اس ترجمے کا اسلوب ملاحظہ کیجئے:

''اے دوست! عشق فرض ہے خدا کے انپڑنے کو، سب عالم پر آہ افسوس! اگر خدا کا عشق نہیں رکھ سکتا ہے تو بارے اپنی پچھانت کا عشق سیتی رکھ کے کیا ہوں، یا ماٹی ہوں یا پانی ہوں یا آگ ہوں یا باراہوں یا خالی ہوں یا نفس ہوں یا دل ہوں یا روح ہوں۔ بارے قدر سیتی آشنائی کی معلوم ہووے تو خوب ہے۔ آہ افسوس عشق کوں کوئی کیا کہہ سکے گا ہور عشق کی نشانی کون دے سکے گا، ہور کوئی صفت کیا کرے گا۔ عشق میں پاؤں دور کھ سکے گا جے کوئی اپس تے بیگانہ ہے سوا، و عشق آگہہ ہے۔ جس جگہ جاتا ہے اسے لتا ہے، اس باج دُسرے کوں رکھتا نہیں۔'' [1]

''شرح تمہیدات ہمدانی'' کے بعد شمائل الاتقیا دکنی (مصنف حضرت رکن الدین دبیر معنوی متوفی ۱۳۳۷ء) کا ذکر ضروری ہے جس کا ترجمہ حضرت میران یعقوب نے کیا جو حضرت حسین خدانما کے فیض یافتہ تھے۔ اس کا انداز بھی ''مفرس'' ہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''پہلا قسم طریقت کے لوگاں کے خوب افعال کے بیان میں ہور سالکاں کے مقاماں ہور مریداں کے مراداں۔ اس قسم میں دوا گلے پچاس بیان ہیں [2]۔''

جمیل جالبی صاحب نے اس کتاب کا زمانہ تکمیل ۱۶۸۳ء بیان کیا ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۶۷۲ء میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم

۱۔ شرح تمہیدات ہمدانی۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان

۲۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ حصہ اول جمیل جالبی ص ۵۰۱

ابوالحسن تانا شاہ کے دور تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ دور فائز دکنی کی مثنوی ''رضوان شاہ و روح افزا'' تک پہنچ کر مکمل ہوتا نظر آتا ہے۔ جمیل جالبی فائز دکنی کو اس ضمن میں اس لئے قابل ذکر سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنی مثنوی کے عنوانات اردو نثر میں قائم کئے۔ فائز دکنی کا انتقال ۱۶۸۲ء میں ہوا۔ تو اب صورت حال یہ سامنے آئی کہ شمائل الاتقیا دکنی کا زمانہ تصنیف ۱۶۷۳ اور ''مثنوی رضوان شاہ روح افزا'' (مشتمل بر عنوانات در نثر اردو) کا زمانہ تصنیف ۱۶۸۲ء یعنی اس ۹ برس کے وقفے میں بھی اردو نثر کا ارتقائی سفر رکتا نہیں ہے۔ بلکہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۶۸۲ء تک پہنچتے پہنچتے ایک نئی لسانی صورت حال سامنے آتی ہے کہ:

(۱) دکنی اردو کا دور ختم ہو گیا۔ اب نئی زبان کا سورج نئی تمازت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔[۱]

(۲) اس دور میں دکنی ریختہ بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔[۲]

اٹھارہویں صدی شروع ہوتے ہوتے ریختہ کا عروج شروع ہو جاتا ہے۔ شاعری اس گفتگو کا موضوع نہیں ورنہ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے حوالے سے ریختہ کے اثرات پر گفتگو کی جا سکتی تھی پھر بھی ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب مولوی محمد باقر آگاہ نے ۱۷۹۶ء میں مذکورہ بالا مثنوی ''رضوان شاہ و روح افزا'' کو دکنی اردو میں منتقل کیا اور اپنے جانتے ''دکنی زبان'' کے احیاء اور حفاظت کی کوشش کی اور باضابطہ دیباچے میں لکھا (جو ۱۷۹۶ء کی اردو نثر کا ایک نمونہ بھی ہے) کہ:

''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بے معنی و ہرزہ داریان لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشن عشق و علی نامہ پر اعتراض کرتے ہیں اور

[۱، ۲] تاریخ ادب اردو۔ جمیل جالبی ص ۵۱۵-۵۱۴۔

جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لگ ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی،
زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج اور طعن وشماتت سے سالم تھی، اکثر شعرا
مثل نشاطی وفراقی وغیرہم کے کہ بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و
غزلیات اور مثنویات وقطعات نظم کیے اور داد سخن وری کا دیئے۔"[۱]

تو اس دکنی زبان کی احیاء وحفاظت کی کوشش میں بھی "مقرس اردو" اپنی چھب دکھارہی ہے۔

جمیل جالبی صاحب نے اس پر لکھتے ہوئے ایک اور پہلو پیدا کیا ہے کہ "زبان دکنی ہوتے ہوئے بھی اردو زبان کے جدید محاورے کے رنگ میں رنگ گئی ہے"۔ جالبی صاحب کا بیان راقم کے بیان سے زیادہ جامع ہے کیونکہ جب میر جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۱ء) کے یہاں الرعدنی الکبرام کے ساتھ ٹھوکم ٹھاکا اور الکھنڈ رات جیسی اصطلاحیں نظر آتی ہیں تو پھر جالبی صاحب کے بیان کی ہی جامعیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ سچ یہی ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ریختہ دکن کے بجائے شمال میں اپنا رنگ جمارہی تھی۔ زٹلی کے علاوہ برکت اللہ عشقی کی کتاب "عوارف ہندی" اور مرزا جان طپش دہلوی (متوفی ۱۸۱۳ء) کی اصطلاحات دربار دہلی اور روزمرہ فصحائے دہلی کا ذکر بھی ضروری ہے جو اردو کو نیا فرہنگ حاصل ہونے کی علامت ہے۔ اسی عہد میں لکھنؤ، فیض آباد، مرشد آباد، ڈھاکہ، عظیم آباد مختلف صوبائی مراکز میں اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہوئی۔ اب ہمارے پاس سید عبدالولی عزلت (جنہوں نے اپنے دیوان کا دیباچہ ۱۷۵۸ء میں لکھا) اردو کے مشہور شاعر سودا (جنہوں نے اپنی مثنوی "سبیل ہدایت" کا دیباچہ اردو میں لکھا) فضل علی فضلی (جنہوں نے ۱۷۴۷ء میں "کربل کتھا" کا دیباچہ اردو میں لکھا) اور شاہ معین الدین حسین علی (متوفی ۱۷۸۴ء) جیسے لوگ موجود

---

[۱] گلزار عشق (قلمی) انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

ہیں جنھوں نے ''فتوح المعین'' نامی نثری کتاب لکھی۔

اسی دور میں قرآن پاک کی مختلف سورتوں کے اردو ترجمے اور تفسیر کا دور شروع ہوا جس میں شاہ مراداللہ سنبھلی کی تفسیر پارہ عم اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر شاہ محمد رفیع الدین (متوفی ۱۸۱۸ء) نے قرآن کریم کی پوری تفسیر اردو میں اپنے شاگرد سید نجف علی خاں سے بول کر لکھوائی جو ''تفسیر رفیعی'' کے نام سے مشہور ہے۔ پھر شاہ عبدالقادر نے ۱۷۹۰ء میں اردو ترجمہ قرآن اور اس کی مختصر تفسیر ''موضح القرآن'' کے نام سے لکھی۔ اس طرح اس ایک صدی میں اردو فارسی کے تخت پر بیٹھتی اور پورے برصغیر ہندو پاک کا واحد ذریعہ اظہار بنتی نظر آتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں جو عیسائی مبلغین عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آئے وہ بھی اردو زبان کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔

اور پھر صورت حال یہ ہوئی صرف مذہبی ہی نہیں علمی اور تاریخی کتابیں بھی اردو میں لکھی جانے لگیں۔ مثلاً ''قصہ واحوال روہیلہ'' مصنفہ سید رستم علی بجنوری (مخطوطہ نومبر ۱۷۸۲ء، بحوالہ تین نثری نوادر، از ڈاکٹر نجم الاسلام، نقوش، لاہور، ۱۹۶۶، ش ۱۰۵، ص ۱۵۳)

''قصہ مہر افروز و دلبر'' کا زمانہ بھی اسی کے آس پاس کا ہے اور پھر ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے بعد ''نوطرز مرصع'' کا زمانہ آتا ہے جس کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ ۱۷۶۹ء کے اوائل میں لکھا گیا اور غالباً یہ کتاب ۱۷۷۴ء تک مکمل ہو چکی تھی۔ بعد میں ''نوطرز مرصع'' ہی کو سامنے رکھ کر میر امن نے اپنی مشہور تصنیف ''باغ و بہار'' لکھی جو شہرت و مقبولیت میں ''نوطرز مرصع'' پر بازی لے گئی۔ اسی دور میں شاہ عالم کی داستان ''عجائب القصص'' بھی سامنے آتی ہے اور سید حسین شاہ کی جذب عشق بھی۔

مذکورہ بالا ساری داستان فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے کی ہے اور ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو نثر مرصّع و مسجّع بھی تھی، مفرّس بھی، اور پرشکوہ بھی۔ مگر بعد کے دنوں میں آہستہ آہستہ سادگی پسند ہوتی گئی۔ یعنی اٹھارہویں صدی میں ایسی سادہ نثر لکھنے کا رجحان پنپتا نظر آتا ہے جو عوام میں مقبول ہو۔ اس ''چلن'' کے عام ہونے میں فورٹ ولیم کالج کا بڑا حصہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے اب ہم انیسویں صدی کے جس نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں، اس میں سادہ نثر مقبولیت حاصل کرتی نظر آئے گی۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد میں نیت کا خلوص شامل نہیں تھا۔ اس کے قائم کرنے کی تین بنیادی وجوہات قرار دی جاسکتی ہیں۔

(۱) انگریز ہندوستانیوں پر مکمل حکومت کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ خود وہ ہندوستانی زبان سیکھ لیں اور اس طرح اس علاقے کو جان سکیں جس پر ان کو حکومت کرنی ہے۔

(۲) اردو اور ہندی کے نام پر ایک ہی زبان ہندوستانی کو دو الگ الگ رسم الخط میں لکھوا کر نفاق کا بیج بو دیا جائے۔ (یہی بیج آج اردو ہندی تنازعہ کی صورت میں برگ و بار لا رہا ہے)

(۳) اس بہانے فورٹ ولیم کالج میں ''دانشور حمایتیوں'' کی ایک فوج تیار کرلی جائے جس کا قلم قبضے میں ہو۔

مگر پھر بھی وہاں جو تصنیفی کام ہوا وہ تو ہم ہندوستانیوں کی محنت کا ہی نتیجہ تھا لہٰذا اس سے نظر چرا کر آگے بڑھنا حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہوگا۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج نے علم و دانش کے فروغ میں قابل ذکر کردار ادا کیا، اپنے بعد سامنے آنے والی علی گڑھ تحریک کو متاثر کیا۔ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ

تحریک واضح طور پر فورٹ ولیم کالج کا پھل کہی جاسکتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ بیان کا جو سادہ اور سہل انداز اور فکر کی جو روشن خیالی ارتقاء پذیر ہو رہی تھی وہ علی گڑھ تحریک کے بانیوں اور سرگرم ارکان کے ذریعہ اپنے بام عروج تک پہنچ گئی۔

مگر علی گڑھ تحریک کا ذکر آتے ہی غالب، انشاء، فقیر محمد گویا، غلام غوث بے خبر، اور غلام امام شہید کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ:

(۱) یہ نثر نگار فورٹ ولیم کالج اور علی گڑھ تحریک کے درمیانی وقفے میں سامنے آنے والے نثر نگار ہیں۔

(۲) ان حضرات میں بھی غالب بطور خاص ایک الگ علامت ہیں۔

حالانکہ غالب کی نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات کی بات بھی کی گئی ہے۔ مگر یہ ادھورا سچ ہے۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ غالب اور (رانی کیتکی والے) انشاء بقول صدیق الرحمٰن قدوائی:

> "ایک تغیر پذیر لسانی صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے اور اپنے اظہار کے لئے نثر کے ایک ایسے طرز کی طرف آنے کی کامیاب یا ناکام کوشش کررہے تھے جس کی اساس عام بول چال کی زبان پر ہو۔ زبان کے اس نئے طرز کے زیادہ حقیقت پسندانہ ادراک کا اندازہ انشاء کی دریائے لطافت کے ان صفحات سے ہوتا ہے جہاں انہوں نے اپنے عہد کی زبان کا (تخلیقی) تجزیہ زیادہ وضاحت سے کیا ہے۔"[۱]

اپنے عہد کی زبان کا تخلیقی تجزیہ اور احساس اگر انشاء اور غالب کے یہاں انفرادی طور پر تھا تو علی گڑھ تحریک میں منظم اور اجتماعی طور پر نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خاں، حالی، نذیر احمد اور وقار الملک وغیرہ نے شعوری طور پر اور منظم ارادے کے ساتھ

---

۱ تاثر نہ کہ تنقید۔ ص ۲۱، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۹۱ء

''نئی نثر'' کی داغ بیل ڈالی۔ مگر اسی صف میں شبلی نعمانی بھی ہیں جو فکر اور بیان دونوں سطحوں پر ایک نیا ''آمیزہ'' تیار کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ فکر کا آمیزہ آج ''دارالمصنفین'' کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور بیان کا ''آمیزہ'' کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس ساز و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجزہ طرازیِ موسیٰ، جاں نوازیِ مسیح سب اسی لئے تھے کہ متاع ہائے گراں تر شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں۔''[۱]

یہ اقتباس اس بات کا شاہد ہے کہ وہ سادہ بیانی جو علی گڑھ تحریک کا طرہ امتیاز تھی وہ ہر وقت شبلی کے لئے بھی وجہ دل کشی رہے ایسا ضروری نہیں ہے۔

اور اب میں اسی وقت یہ خیال بھی درج دفتر کرنا صائب سمجھتا ہوں کہ سرسید کی سادگی اور شبلی کی مذکورہ بالا مرصع نثر کے اثرات کا سیدھا نتیجہ رشید احمد صدیقی کی نثر ہے۔

آیئے رشید احمد صدیقی سے پھر پیچھے کی طرف یعنی سرسید اور شبلی کی طرف چلا جائے کیونکہ یہی وہ عہد ہے جس کے آگے پیچھے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مولانا

---

[۱] سیرت النبیؐ جلد اول۔ ص ۱۲۳۔

ابوالکلام آزاد جیسے نابغہ اردو ادب کو میسر ہوئے جن کی نثر فورٹ ولیم کالج اور علی گڑھ تحریک کے عمومی رویئے سے الگ اس روایت کی توسیع کرتی نظر آتی ہے جو دکنی اردو اور ریختہ کے ''مفرّس'' انداز بیان کے تحت سامنے آنے والی کتاب ''نوطرز مرصع'' میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری بلکہ افسانہ نگار ابوالکلام کا خیال آتے ہی اردو افسانے اور داستان کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عرض یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء کے آس پاس لکھی گئی کتاب ''نوطرز مرصع'' کے بعد ۱۸۱۴ء میں سامنے آنے والی داستان ''نورتن'' (مصنفہ محمد بخش مہجور) اور ۱۸۳۷ء میں مکمل ہونے والی رجب علی بیگ سرور کی داستان ''فسانہ عجائب'' اور پھر ۴۴-۱۸۴۳ء کے آس پاس آنے والی ''الف لیلہ'' ۱۸۶۰ء میں اردو قارئین تک پہنچنے والی داستان ''طلسم ہوش ربا'' اور ۱۸۷۲ء میں منظر عام پر آنے والی داستان ''طلسم حیرت'' کا ذکر بھی اشد ضروری ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس نے پریم چند کے ''دنیا کا انمول رتن' سجاد حیدر یلدرم کے ''خارستان و گلستاں'' نیاز فتح پوری کے ''کیوپڈ و سائکی'' اور ''الحمراء کا گلاب'' اور سلطان حیدر کے ''سمن پوش'' اور ایسی متعدد تصانیف کو جنم دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ یلدرم کے یہاں دنیا اور کائنات کو دیکھنے کا جو رومانی نقطہ نظر تھا اور بیان میں جو شیرینی و شکوہ تھا اسی نے قاضی عبدالغفار، حجاب امتیاز علی اور امتیاز علی تاج کی متعدد تحریروں مثلاً ''لیلیٰ کے خطوط'' ''صنوبر کے سائے اور کہ عالم دوبارہ نیست پر اپنے اثرات مرتب کئے۔

دوسری طرف علمی اور مذہبی مقالات کی دنیا میں یہ وہی عہد ہے جس کا ایک سرا علی گڑھ تحریک کے اندازِ بیان سے اور دوسرا ''اسلوب جلیل'' یا ''اسلوب مفرّس'' سے ملتا دکھائی دیتا ہے جس کی بہت ہی منقلب صورت رشید احمد صدیقی کے یہاں بھی بہ آسانی

تلاش کی جا سکتی ہے۔

دراصل ترقی پسند تحریک کا حقیقت پسندانہ رجحان اور سجاد حیدر یلدرم سے رشید احمد صدیقی تک کا رومانی رجحان دونوں کسی نہ کسی طرح ادیبوں کے لئے توجہ کا سبب بنتے رہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس رومانی رجحان (اور اگر رومانوی رجحان نہیں تو کم ازکم ''اسلوب جلیل'' کی طرف جھکاؤ) کے سبب صرف سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالکلام آزاد ہی سامنے نہیں آتے بلکہ شیخ اکرام عبداللطیف، طفیل احمد، خواجہ غلام السیدین، عابد حسین، محمد حبیب، اور بہار میں نصیر حسین خاں خیال، اجتبیٰ حسین رضوی، جمیل مظہری (فرض کی قربان گاہ پر)، علی اکبر قاصد، سلطان احمد اور ہمارے موضوع بحث مصنف مولانا انوارالحق شہودی وغیرہ علم، ادب، سیاست مذہب وغیرہ مختلف میدانوں میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

اس طرح ہم ترقی پسند تحریک کے زمانہ آغاز تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہے اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا انوارالحق نازش سہرامی کی پہلی غزل کا زمانہ تصنیف ۱۹۳۰ء ہے اور جس دفتر اول میں ۱۹۳۰ء والی غزل دستیاب ہے اس میں ۱۹۳۳ء تک کی غزلیں مع تاریخ محفوظ ہیں اور انہی کے بیچ پہلی نثری (افسانہ نما) تحریر بھی دستیاب ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نثری تحریر کا زمانہ تصنیف بھی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء کے درمیان رہا ہوگا۔

مگر ترقی پسند تحریک اور انگارے گروپ کی ادبی اور نظریاتی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ مولانا شہودی (شعر میں تو نہیں مگر) نثر کے میدان میں ان دونوں گروپوں سے الگ ہٹ کر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ دونوں ہی گروپ فکری سطح پر دنیا، سماج اور کائنات کو جس نظر سے دیکھنا چاہتے تھے اور دیکھ رہے تھے اس میں وجدانی، الہامی اور مذہبی ذرائع،

انداز نظر اور انداز بیان کی نہ تو کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی کوئی ضرورت جب کہ ترقی پسند تحریک اور انگارے گروپ دونوں سے پہلے، دونوں کے زمانے میں اور دونوں کے بعد بھی مصنفین کا ایک ایسا بڑا حلقہ موجود تھا جو اس وجدانی، الہامی اور مذہبی انداز نظر اور انداز بیان کا قائل اور فاعل تھا۔ اس گروپ کا سب سے بڑا قطب نما علی گڑھ تحریک کے بعد شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سلیمان ندوی وغیرہ جیسے مذہبی نابغہ تھے۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی میں کئی ایسے مذہبی ادارے بھی قائم ہوئے جو بدلتے ہوئے ذہنی رویوں کا سبب بنے اور ان مذہبی اداروں سے متعلق مصنفین کی تصنیفات نے بھی آگے آنے والے ویسے مصنفین کی ذہنی تشکیل میں بہت اہم رول ادا کیا جو آزادی کے بعد کے دنوں میں بھی پوری طرح متحرک نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی مصنفین میں ہمارے موضوع بحث مصنف مولانا انوارالحق شہودی نازش سہسرامی بھی شامل ہیں۔

میری مراد دیوبند، ندوہ، جامعہ نعیمیہ مراد آباد، مدرسہ سجانیہ الہ آباد، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہے۔ یہ سب ادارے ایک ساتھ نہیں قائم ہوئے لیکن انہوں نے آگے پیچھے اپنا اعتبار ضرور قائم کرلیا اور مسلسل ویسے مصنفین کی ذہنی سرپرستی اور رہنمائی کرتے رہے جو آدمی اور کائنات کے مطالعہ میں مذہب کو ایک ضروری عنصر سمجھتے تھے۔

اس معاونت میں کچھ افراد کا بھی ناقابل فراموش حصہ رہا، ایسے افراد میں مولانا آزاد اور الہلال والبلاغ کے ذریعہ ان کی تحریروں کا ذکر ناقابل فراموش ہے۔

ہفت روزہ الہلال جولائی، ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور اس کا پہلا دور ۱۹۱۴ء میں ختم ہوگیا۔ اس عرصہ میں انگریزی حکومت نے دوبار ضمانتیں طلب کیں۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے البلاغ جاری کیا۔ البلاغ اور الہلال میں صرف نام

کافرق تھا۔ اسے الہلال کا ہی دوسرا دور کہنا چاہئے۔ یہ اخبار مارچ ۱۹۱۶ء تک
جاری رہا۔ اس کے بعد الہلال کا تیسرا دور جون ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا اور اسی
سال دسمبر میں ختم ہو گیا۔"[1]

جہاں تک مولانا شہودی پر الہلال کے اثرات کا سوال ہے وہ اس لئے بھی منطقی طور پر صحیح لگتا ہے کہ الہلال ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا، مولانا شہودی 1915ء میں پیدا ہوئے۔ اور الہلال و البلاغ کا آخری دور ۱۹۲۷ء میں ختم ہوا اور ہمارے موضوع بحث مصنف تصنیفی اور تخلیقی طور پر ۱۹۳۰ء سے سامنے آتے دکھائی دیتے ہیں گویا اگر مولانا انوار الحق شہودی پر مولانا آزاد کے اثرات کی بات کی جائے تو یہ اس لحاظ سے فطری ہے کہ جب مولانا نے مطالعہ شروع کیا ہوگا تو الہلال و البلاغ نے سب سے پہلے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہوگی کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ الہلال و البلاغ کی اشاعت سے آزادی کے آس پاس تک ان دونوں اخبارات کا جادو اس زمانے کے ادباء و مصنفین پر چھایا رہا بلکہ غالباً یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ افسانوی سطح پر پریم چند کا تتبع اور علمی و مذہبی سطح پر مولانا آزاد کی پیروی اس زمانے کا عام علمی اور ادبی چلن بن چکی تھی۔

مولانا آزاد کے علاوہ اشخاص میں فاضل بریلوی حضرت مولانا احمد رضا خاں، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، مولانا سلیمان ندوی اور ان حضرات کے علاوہ ادباء اور شعراء میں علامہ اقبال کے بعد جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی اور اختر اورینوی اور خالص سہسرام کی سطح پر مولانا ابو محمد مصلح وغیرہ نے (جن کے رسالے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی معاون مدیر تھے) حضرت مولانا انوار الحق شہودی کو یقینی طور پر مہمیز کیا ہوگا۔

اس مقام پر قومی اور علمی معرکہ آرائیوں کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری

---

[1] الہلال کے منتخب افسانے۔ مرتب کوثیاوی راہی

ہے، سب سے بڑی معرکہ آرائی تو کانگریس اور مسلم لیگ کی تھی جس کے نتیجے میں محمد علی جوہر اور حسرت موہانی کے افکار سامنے آئے۔ دوسری معرکہ آرائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اس کے فکری رویوں سے اختلاف کرنے والوں کی تھی جس کے نتیجے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وجود میں آیا جس نے ذاکر حسین جیسا ''انفرادی ادارہ'' اردو دنیا کو بخشا اور ذاکر صاحب نے پورا جامعی گروپ تیار کیا۔ تیسرا محاذ دیو بند سے اختلاف کرنے والوں کا تھا جس نے ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ نعیمیہ مراد آباد اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کی صورت میں تین ایسے ادارے اردو دنیا کو عطا کیے جس سے منسلک علماء اور ادباء نے ادبی اور علمی صورت حال میں یقیناً کچھ اور بدلاؤ کی صورت پیدا کی۔

اس طرح ایک پورا علمی اور تصنیفی ماحول بنتا نظر آتا ہے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے موضوع بحث مصنف کی تحریروں پر مولانا آزاد کی تحریروں کا اثر تو ضرور پڑا مگر وہ اسی اثر کے حصار میں گھر کر نہیں رہ گئے بلکہ انہوں نے اصناف کے لحاظ سے شعوری طور پر اپنے منفرد اسالیب تلاش کیے۔ نتیجتاً جہاں ان کی افسانہ نما تحریروں پر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے اثرات دکھائی دیتے ہیں وہیں سوانح اور تذکرہ کے ضمن میں ان کا بیان خاصا معروضی نظر آتا ہے۔ اسی طرح تاریخ و فلسفہ کے ذیل میں مولانا وہ انداز بیان اپناتے نظر آتے ہیں جو دراصل تاریخ اور فلسفہ کے لئے موزوں ہے، سیاست اور ملت کے مسائل پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سلیمان ندوی کے بھی ہم نوا بنتے دکھائی دیتے ہیں اور ادبی علمی سطح پر رشید احمد صدیقی کے انداز بیان کو پسند کرتے نظر آتے ہیں البتہ مذہبی، صوفیانہ اور مکتوباتی نثر میں بہت واضح طور پر ''طرز آزاد'' کے ہم نوا ہوتے نظر آتے ہیں۔

یہ سارا تذکرہ ترقی پسند تحریک کے ذرا پہلے تک کا ہے جب وہ مختلف اسالیب کو چھوتے اور پرکھتے نظر آتے ہیں مگر اردو نثر میں اسلوب نازش کی دریافت کا عمل ابھی

باقی ہے۔

البتہ یہ اعتراف ضروری ہے کہ مولانا شہودی کی نثر پر ترقی پسند فکر یا ترقی پسند نثر کی تلاش کا عمل غیر ضروری ہے کیونکہ ترقی پسند ادباء اور مولانا شہودی کے درمیان فکری تطابق نہیں ہے اور اسلوب کی سطح پر اوپر دکھایا جا چکا کہ اسی زمانے میں متوازی طور پر ایسے ادارے، افراد اور افکار موجود تھے جو ترقی پسند تحریک کا نعم البدل بھی تھے اور جنہوں نے یقینی طور پر اور منطقی طور پر مولانا انوار الحق شہودی کو زیادہ متاثر کیا ہوگا۔

محاکمہ:

گزشتہ صفحات میں جو تفصیلی گفتگو کی گئی اس کا مختصر الفاظ میں محاکمہ کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ:

(۱) حضرت مولانا انوار الحق شہودی نازش سہسرامی کی یہ کتاب ان کی ایک درجن سے زیادہ غیر مطبوعہ کتابوں میں سے ایک ہے۔

(۲) حضرت مولانا انوار الحق شہودی کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکیں اور بشمول اس کتاب کے چار مزید کتابیں ۲۰۰۷ سے ۲۰۱۰ء کے درمیان منظر عام پر آ جائیں گی۔

(۳) حضرت مولانا شہودی کی ہنوز ایک درجن سے زیادہ کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔

(۴) مولانا شہودی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ اپنی حیات میں وہ مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، صوفیانہ، اور خطیبانہ محاذ پر ایک معروف شخصیت رہے اور ملک وصوبہ کے درجنوں رسائل میں ان کی تحریریں شائع بھی ہوتی رہیں۔

(۵) اساتذہ میں حضرت مولانا مشتاق احمد کانپوری، حضرت مولانا عبدالکافی الہ آبادی اور صدرالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین، معاصرین میں حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا احمد عروج قادری، اور مجبور شمسی جیسے مشاہیر سے مولانا کا اکتساب و ارتباط مولانا کے ''علمی اشتغال وارتباط'' کا اشاریہ ہے

(۶) آپ کے انتقال پر بہار میں ہی نہیں پورے ملک میں ان کو جاننے والوں نے انہیں کماحقہ خراج عقیدت پیش کیا۔

(۷) انتقال کے بعد ان کے فضل وکمال پر لکھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے اور تادم تحریر ان کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر طلحہ رضوی برق سے ڈاکٹر مظفر عالی تک کم وبیش اردو کے بیس معروف ومشہور ادباء مضامین لکھ چکے ہیں۔

(۸) ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں پر پی ایچ ڈی کا کام بھی ہو چکا، ان کی کتاب ایم اے کے نصاب میں بھی شامل رہی اور ''انقلاب جدید'' (پٹنہ) میں خدابخش آرکائیوز کی جانب سے مشاہیر بہار کے ضمن میں ان پر مرسلہ رائٹ اپ بھی شائع ہوا۔

(۹) مولانا شہودی کی نثر کو عام طور پر نثر ابوالکلام کی توسیع کہا جاتا ہے۔ اس خیال کے پیش نظر اس مضمون میں ان کی تین کتابوں کے اقتباسات کے حوالے سے یہ دیکھنے کی بھی کوشش کی گئی کہ یہ مفروضہ کس حد تک صحیح ہے۔

(۱۰) راقم الحروف بغائر مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اصناف کے تنوع کے سبب اسلوب بھی یکساں طور پر اور ہمیشہ ابوالکلامی نہیں رہتا، اس میں کبھی کبھی علامہ شبلی اور کبھی کبھی رشید احمد صدیقی کا آہنگ بھی سانسیں لینے لگتا ہے۔

(۱۱) لیکن اس کے باوجود اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اسلوب شہودی پر ابوالکلامی نثر ہمیشہ اثر انداز نہ رہے یہ تو ممکن ہے مگر اردو نثر کا جو ایک پرشکوہ اسلوب اور اسلوب جلیل رہا ہے وہ بہرحال مولانا شہودی کا طرہ امتیاز ہے۔

(۱۲) مگر اس اسلوب کے بارے میں علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک کے موئدین اور عاملین کے ذریعہ ایک عجب قسم کا التباس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ "اسلوب جلیل" اردو نثر کی روایت کا حصہ نہیں ہے۔

(۱۳) میں نے جب اس الزام کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو نثر کی ابتدا سے عہد نازش تک کی اردو نثر کا مطالعہ شروع کیا تو نتیجہ اس الزام کے برعکس سامنے آیا۔

(۱۴) میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ کلمتہ الحقائق، (۲) اردو رسالہ تصوف (۳) سب رس (۴) معراج العاشقین (۵) دستور العشاق (۶) تاج الحقائق (۷) رسالہ چہار وجود (۸) شرح تمہیدات ہمدانی (۹) شمائل الاتقیا (۱۰) مثنوی رضوان شاہ و روح افزا (۱۱) دیوان عبدالولی عزلت (۱۲) مثنوی سودا (۱۳) اور کربل کتھا کا دیباچہ بزبان نثر اردو (۱۴) فتوح المعین (۱۵) قصہ مہر افروز و دلبر (۱۶) نوطرز مرصع (۱۷) عجائب القصص (۱۸) نورتن (۱۹) فسانہ عجائب (۲۰) الف لیلہ (۲۱) طلسم حیرت (۲۲) داستان امیر حمزہ (۲۳) ایرج نامہ (۲۴) تورج نامہ (۲۵) داستان طلسم زلزال (۲۶) طلسم لالہ زار (۲۷) طلسم چاہ زمرد (۲۸) طلسم ہوش ربا (۲۹) طلسم فتنہ نور افشاں (۳۰) طلسم ہفت پیکر (۳۱) طلسم خیال سکندری (۳۲) طلسم نوخیز جمشیدی (۳۳) محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کی طلسم ہوش ربا (۳۴) خارستان و گلستاں (۳۵) کیوپڈ و سائکی (۳۶) الحمراء کا گلاب وغیرہ کم از کم ایسی پچاس کتابیں اور تحریریں بہ آسانی

نذر قارئین کی جا سکتی ہیں جن میں مفرس اسلوب، پرشکوہ اسلوب، اسلوب جلیل اور اسلوب شہودی کا ایک مضبوط اور مسلسل پس منظر موجود نظر آئے گا۔

(۱۵) اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا انوار الحق شہودی کا اسلوب اردو نثر کے متواتر اور مسلسل اسلوب کا ہی حصہ ہے۔

(۱۶) اور یہ کتاب اردو نثر کے متواتر و مسلسل اسلوب کا خوب صورت تواتر اور توارث ہے۔

وماعلينا الا البلاغ المبين.

حسین الحق

۱۴ فروری ۲۰۰۷ء

ابتدائیہ

دست طلب کی درازمندیوں اور جہد للحیات کی آرزوؤں نے نئے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہندوستان کے ارباب حل وعقد کے سپرد کر کے نگار خانہ ہستی میں نئی امنگوں اور نئے نئے ولولوں کی وویعتیں زندہ کردی ہیں اور کون ہے جو اب اس شورش عمل سے منہ موڑ سکے۔

یقیناً صدیوں سے حریت واستقلال وطن کی راہ میں ایثار وقربانی کی نذر پیش کرنے والے اپنی اس تگ ودو کے نتائج کے انتظار میں تڑپ رہے تھے اور جو کچھ ہوا وہ کوئی معجزہ یا مافوق الفطرت کارنامہ نہ تھا، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ قرنہا قرن کی اخلاقی اور قومی بربادیاں کسی قوم کو زندہ وپائندہ کرنے کے لئے جو کچھ کرتی آئی ہیں وہ سب کچھ ہوا۔ کسی قوم کی تباہی اور بربادی خارجی اثرات کے تحت کم وقوع پذیر ہوتی ہے، بگڑنے اور روبہ اضمحلال ہونے کے وہ تمام کے تمام مہلکات ومفاسد جو زندگی میں جمود وانحطاط اور اختلال وانتشار پیدا کرتے ہیں سب سے پہلے ان کی نشوونما اپنے اندر ہوتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جو صدیوں شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا پس فی الاصل صدیوں سے مہلکات اور مفاسد نے خود ہم پر یہ حقیقت روشن نہیں ہونے دی کہ ہم رزم گہہ حیات کی انتہائی خطرناک گھاٹیوں سے گذر رہے ہیں اور مہلکات ومفاسد کی یہ خطرناک

سازشیں خود ہماری نگاہوں سے محو ہو رہی ہیں، غور کیجئے تو ہمارے پیچھے شکست و ریخت کی ہزار ہا ہزار مجروح کامیاں پڑی ہوئی ہیں اور سوچئے تو ماضی کا ہر لمحہ اپنے دامن میں ایک دل آویز کہانی چھپائے ہوئے ہے۔

ہندوستان سے مغل اقتدار کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کا زمانے کی بے رحم پھونکوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ جانا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں کیوں کہ دنیا میں ہمیشہ یونہی ہوتا آیا ہے مگر حقائق پر نگاہ رکھنے والے اسے ناقابل اعتنا نہیں کہہ سکتے کیونکہ جو کچھ ہوا وہ اندر اندر موجود بغی وفساد کی ان لہروں کے ہاتھوں ہوا جو لخت جگر میں خون بن کر دوڑ رہی تھیں۔

لہٰذا آج جب ہماری کائنات فکر ونظر پر جمود و اضمحلال اور پراگندگی و برہمی کا اندوہ ناک دھواں چھا رہا ہے، کارخانہ حیات کا ہر گوشہ المناکیوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے، پچھلے تمام کے تمام امید واعتماد کے سانچے ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں اور وقت وتغیر کے ہاتھوں ایک نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس پس منظر کو بھی نگارخانہ تخیل وتصور میں آراستہ کرلیں جس کا بدیل ومثیل آج تک پیش نہیں کیا جاسکا۔

پس منظر:

آغازِ اسلام اور شدائد ومصائب کی ہول ناکیاں

اسلام دنیا میں حق وصداقت کا علمبردار ہے، اس نے عرب کے بے آب وگیاہ خطے میں آنکھیں کھولیں، بوجہل وبولہب کا حریف بن کر پروان چڑھا اور ان تمام موانع ومقاطع سے نپٹا جو تاریخ عالم میں کسی بھی مشن کو ناکام بنانے کے ضروری اسباب و ذرائع ہو سکتے ہیں۔

شارع اسلام کی پکار پکار نہ تھی۔ اکابر قریش کے خرمن حیات پر بجلیوں کی کوند تھی جس نے ان کے بنائے ہوئے (ناقص) نظام حیات میں شکستگی و برہمی کی ایک آگ پھونک دی کیونکہ یتیم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے آبائی ورثہ عبادت و جہالت کو مذموم قرار دے کر ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنے کی دعوت دے رہے تھے جب کہ ان کے بنائے ہوئے جھوٹے خداؤں کی پرستش ان کے ورثہ میں آئی تھی۔

واذاقیل لھم آمنو کما امن النّاس

اور جب ان سے کہا جاتا کہ (اے گم گشتگانِ راہ) ایک خدا پر ایمان لاؤ جس طرح اور لوگوں نے خدائے واحد کی اطاعت قبول کی ہے۔ **قالو انومن کما امن السفھا**۔ تو یہ بدبخت جواب دیتے کہ ہم بھی بے وقوف ہیں؟ جو بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟

گویا شمع نبوت کی فروزانیاں خاک دان دہر کو پرنور کرنے کے لئے قدوسی قوت و استقلال اور محمدی صبر و کمال کے ساتھ جھولیاں بھر بھر کر مملکت الٰہی پر نورانی کرنیں انڈیل رہی تھیں، انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو سنبھالا دے کر ساحل مراد تک پہنچانے کی مہم سر کر رہی تھیں، ایک خدا کی زمین پر ایک ہی خدائے حیّ و قیوم کے عزت و جلال کی عظمت و بندگی کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہی تھیں، خدا اور بندے کے درمیان ٹوٹے ہوئے ناطے کو جوڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، اخلاقی اور سماجی ذمائم کا استیصال کرنے کے لئے خدائی نظام حیات مرتب ہو رہا تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں ان الحکم الاللّٰہ (حکمرانی اور مالکیت صرف اللہ کی ہے) کی حقیقت و صداقت کو تمام شعبہ ہائے حیات پر محتوی و مستولی کرنے کا اہتمام سرانجام پا رہا تھا اور دوسری جانب روسائے مکہ اور سرداران قریش کی ہلاکت آفریں معاندانہ مخالفتیں سدراہ تھیں۔

بوجہل و بولہب کا متکبرانہ کارخانہ جاہ و غرور اپنی تمام سرگرمیوں کے ساتھ معروف پیکار تھا......کوئی کہتا......"

ان هی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا و مانحن بمبعوثین (پ ۱۷)

معادو آخرت اور حشر و نشر کی عجیب و غریب منطق صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذہنی اپج ہے ورنہ جو کچھ ہے ہماری یہی دنیوی زندگی ہے، جی رہے ہیں جب تک قوت ہے اور انحطاطی دور میں مر جائیں گے اور دوبارہ پھر کبھی اٹھائے نہ جائیں گے۔

کہیں سے آواز آتی۔ خواہ مخواہ ہمیں تنگ کیوں کر رہے ہو؟

لوشاء اللہ مااشر کنا ولا آبائنا (پ ۸)

اگر تمہارا خدا چاہتا تو ہم یا ہمارے باپ دادا جھوٹے خداؤں کو نہ پوجتے۔

ان شیفتگان شقاوت و ضلالت میں سے کسی کا حال یہ تھا۔

واذالقواالذین آمنو قالوا آمنا

جب اپنے پڑوسی مسلمانوں سے ملتے تو کہتے کہ ہم تو ایمان قبول کر چکے۔

واذاخلو الی شیطینھم قالو انا معکم انمانحن مستھزؤن (پ-۱)

اور جب اپنے شیطان صفت دوستوں سے تنہائی میں ملاقات ہوتی تو کہتے ہم تو پوری طرح تمہارے ساتھ ہیں، ان مسلمانوں کے ساتھ اسلام اور شارع اسلام کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

غرض کہ سارا کا سارا کارخانہ کفر و ضلالت اپنی تخریبی سرگرمیوں میں مصروف کار تھا، غور تو کیجئے شارع اسلام کی حیات طیبہ میں اور بالخصوص ان دنوں میں جو مکہ میں گذرے، ہلاکت آفرینیوں اور ایذا رسانیوں کا وہ کون سا منصوبہ باقی رہ گیا جو خدا کے محبوب، آمنہ کے لال کے لئے بروئے کار نہ لایا گیا، نوع انسانی کی تاریخ ہر دور اور ہر قرن میں مصلحین و مرسلین کی مثالیں پیش کرتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ حیات شدائد و مصائب کا جو بھیانک نقشہ پیش کرتی ہے اس کی کوئی مثال نہیں

ملتی۔

بظاہر بے یار و مددگار نوجوان جو اپنے آبائی معاشرے سے انی بڑی مماثتشر کون کا آوازہ حق وصداقت بلند کرتا ہوا ایک نئی دنیا کی نشوونما کے لئے عزیمت واستقلال نبوت کے سہارے دنیا کو دعوت غور وفکر دے رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے بلکہ اس کی زبان معجز بیان سے کہلانے والا خدائے واحد کہلا رہا ہے۔

قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموللّٰه مثنیٰ وفرادی ثم تتفکر وا ما بصاحبکم من جنة. ان ھو الانذیر لکم (پ۲۲)

اے نبی ان لوگوں سے کہئے کہ میں تمہیں ایک اچھی بات بتاتا ہوں، اللہ کے لئے تم انفرادی طور پر اور جماعتی شکل میں کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو اور سوچو کہ جو باتیں ہم تم سے کہہ رہے ہیں اور ذمائم اخلاق کے استیصال کے لئے ہم جو کچھ کر رہے ہیں (یہ قول وعمل کس حد تک صائب ہے) تم خود اس فیصلہ پر پہنچو گے کہ تمہارا دوست مجنوں نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور جس راہ حق پر تمہیں بلا رہا ہے وہی حق ہے کیونکہ:

ھذہ سبیلی ادعو الی اللہ علی بصیرة انا ومن اتبعنی سبحن اللہ وما انا من المشرکین (پ-۲۲)

ہماری یہ راہ کہ ان ھذا صراطی مستقیما (پ-۸) یہی سیدھی راہ ہے کہ ہم بلا رہے ہیں خدائے حیی وقیوم کی بارگاہ عز وجلال کی طرف، یہ راہ بصیرت عظمی پر مبنی ہے، میں اور جو میرا متبع ہے اس کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری فوز وفلاح کی راہ نہیں!

لیکن ان تیرہ بختان فکر ونظر پر جب آیات بینات پیش کی جاتیں تو اعراض و انکار کی ساری محرومیاں جمع ہو کر انحراف وسرکشی کے سارے طریقے زندہ کر دیتیں، قرآن کہتا ہے:

واذا تتلی علیھم ایاتنا بینت قال الذین کفروا للحق لما جاءھم ھذا

سحرٌ مبین۔
اے نبیؐ! ہم خبردار ہیں اس سے کہ جب آپ ان پر میری آیات بینات تلاوت کرتے ہیں تو یہ سارے کے سارے نافرمان اس حق کے لئے جو ان کے پاس بھیجا گیا ہے کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ قرآن و اسلام محض شعبدہ اور جادو ہے محمد کا۔
اور اس طرح اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے میں اور ہر ممکن تخریبی و ہلاکت آفریں عزائم خبیثہ میں پورے اہتمام و انتظام سے سرگرم و کوشاں تھے۔ اور باوجود اس کے کہ نبی کریمؐ نے بار باران پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ

لاشریک له و بذلک امرت و انا اول المسلمین۔

تم جو چاہو کر ڈالو ہم اس قول حق اور اعلان حق سے ہرگز ہرگز پھر جانے والے نہیں اور جب تک اس مقصد اعظم کی تکمیل نہ ہو جائے ہم اس حقیقت کو اجاگر کرنے اور نوع انسانی کے اعمال و حیات کے ایک ایک گوشہ میں رچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے کیونکہ میرے ظہور و بعثت کا مقصد واحد یہی ہے کہ مملکت الٰہی پر ایک صلاحیت یافتہ سوسائٹی کی تشکیل کر کے انسانیت کے بلند اصولوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کو معرض عمل میں لائیں اور سن لو کہ

انا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں)

تمہاری ان ساری معاندانہ سازشوں کا بنا بنایا گھروندا آج نہیں تو کل ڈہ جائے گا اور کفر و شرک کی یہ ناپاکیاں ایک ایک کر کے محو ہو جائیں گی کیونکہ وحی الٰہی کی لازوال روشنی میرے خاشع اور خاضع قلب کو امید کی ملکوتی کرنوں سے جگمگا چکی ہے۔
اور دنیا نے دیکھا کہ رب ذوالجلال والاکرام کی جانب سے آنے والے اسی الٰہی پیغام نے اعلان کیا

جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔
(حق نمودار ہوا اور باطل فنا ہو گیا، بیشک باطل کو تو فنا ہونا ہی ہے۔ ح۔۱)

مخالفت اسلام ونبوت کے لئے اجتماعی عملی اقدام:

صفحات ماقبل میں عرض کیا جا چکا کہ پیغام نبوتؐ ایک سڑے گلے معاشرے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کا اعلان تھا اور کفار مکہ نوع انسانی کے تمام گمراہ افراد کی طرح ''طریقہ آباء'' سے ہٹنے کے لئے کسی طور تیار نہیں تھے۔ نتیجتاً شرار بولہبی نے چراغ مصطفویؐ کے ساتھ ستیزہ کاری کا کھیل شروع کیا مگر شروع شروع میں یہ معاملہ زیادہ تر انفرادی رہا، خود نبی کریم کو مکہ کے اوباش صفت افراد کی جانب سے ایذائیں برداشت کرنی پڑیں اور پھر جو حضرات اسلام لے آتے ان کے ساتھ بھی انفرادی سطح پر ایسی ہی شرارتیں کی جاتیں۔

مگر کفار و اشرار مکہ نے جب دیکھا کہ اس طرح کے انفرادی اقدام بے اثر ہوتے جا رہے ہیں اور رسول اکرمؐ کا حلقہ فوز و فلاح وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور کفار و اشرار مکہ کے اندر اندر سلگتی مخالفت وعناد کی چنگاریاں محمدؐ بن عبداللہ کی عملی سرگرمیوں پر کوئی مفید اثر نہیں ڈال پا رہی ہیں تو مکہ والوں کی ایک اجتماعی مجلس مشورت طلب کی گئی اور کفار نے اپنے ناپاک منصوبوں پر دوبارہ غور کیا اور از سر نو پالیسی مرتب کی اس کا ایک نمونہ تاریخ اسلام میں موجود ہے کہ رئیس مکہ عتبہ حاضر خدمت نبویؐ ہو کر تملق آمیز انداز میں کہتا ہے کہ ''میرے عزیز! سیم وزر کی خواہش ہے تو کہو ہم زر و جواہرات کا ڈھیر تمہارے آگے لگا دیں گے، عزت و سروری کی آرزو ہے تو بولو، ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کرنے کو تیار ہیں، عرب کی کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو نازنینان عرب نذرانہ میں موجود ہیں، جسے چاہو منتخب کر لو مگر ہم اس کے لئے اب تیار نہیں ہیں کہ

تم ہمارے خداؤں کو برا کہو اور ہمیں ان کی پرستش سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔''

اس کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چیں بجبیں ہوئے بغیر قرآن کریم کی چند آیات پڑھ دیں اور عتبہ مبہوت و ششدر ہو کر فوراً اپنے خرابہ کفر میں جا کر بیٹھ رہا، حوصلہ مندان کفر و شرک پر حیرت و استعجاب کی اک برق کوندی کیوں کہ یہ بات ان کے فہم و تدبر سے باہر کی بات تھی کہ دنیاوی لذائذ و انعام کو صرف ایک آئیڈیل کی خاطر ٹھکرایا بھی جا سکتا ہے، دراصل انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ کارساز ازل ان گمراہوں کی خطرناک چالوں سے تو نبی اکرم کو پہلے ہی ہوشیار و خبردار فرما چکا اور اپنی نصرت و اعانت کا وعدہ فرما چکا:

وان یریدو ان یخدعوک فان حسبک اللہ

اگر یہ نافرمان تمہیں دھوکا اور فریب دے کر نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو کوئی پروانہیں، یقیناً تمہارا اللہ تمہاری نصرت و اعانت کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا کافرین و ضالین کی یہ مذموم کوشش بھی ناکام ہوئی۔

معاندانہ کوششوں اور سازشوں کا دوسرا قدم:

عتبہ کی ناکامی و محرومی نے غیض و غضب اور زیادہ کر دیا اور مخالفانہ چشمکیں یہ بتا رہی تھیں کہ کوئی خطرناک قدم اٹھایا جانے والا ہے کیونکہ غصہ و انتقام کا جذبہ اور وہ بھی عرب کے اس نامور خاندان و قبیلہ میں جو تولیت کعبہ اور اہتمام حرم کے تفاخر و تفوق کو اپنے لئے سند افتخار و اعزاز سمجھتا ہو کتنا آتش آثار ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ غالباً مشکل نہیں۔

نتیجتاً رؤسائے مکہ نے ایک مرتبہ پھر اپنی بساط بچھائی اور نئی چال چلنے کا فیصلہ کیا گیا، ناموران مکہ کا ایک وفد ابوطالب کے پاس پیغام نما دھمکی لے کر پہنچا۔

''اپنے بھتیجے کو نئے مذہب کی تلقین و تبلیغ سے روکو ورنہ ہم اب کسی نہ کسی
دن اسے ختم کر دیں گے۔''

وارفتہ محبت ابوطالب بشریت کے متضاد تقاضوں سے عہدہ برا نہ ہو سکے وعدہ کر دیا اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پاس آ کر فرمایا:

''اب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، محمدؐ کس کس سے لڑو گے، غیض و
غضب اور وہ بھی روسائے مکہ کا؟ بہتر ہے کہ اپنے طرز عمل کو بدل دو اور ہر روز
سامنے آنے والی شدائد و مصائب کی وارداتوں کا خاتمہ کرو۔''

چھٹی صدی عیسوی کا مورخ اس مرحلہ استقلال و عزیمت اور قیام دعوت حق و صداقت پر انگشت بدنداں ہے۔ اس مجاہد اعظمؐ اور حامل انسانیت کبریٰ کو تو تقدس و ملکوتیت کے ایسے عظیم پیکر میں دنیا سے روشناس کرایا گیا جو اسؐ کے شایان شان ہو سکے ورنہ اس شورش کدہ لہولعب میں جہاں زندگی اور اساس زندگی ہی منتہا و مقصود ہے کون ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عربی کی زندگی زیادہ قیمتی تھی یا وہ عشق جس نے قربان گاہ ناز میں جان عزیز کی بازی بھی لگا دی اور دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرا دیا کہ عشق سوا محبوب و مطلوب کے ہر ماسوا کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

العشق نار یحرق قلوب العاشقین ماسوی المحبوب

(عشق ایسی آگ ہے جو عاشقوں کا قلب بھی جلاتی ہے اور محبوب کے علاوہ
سارا کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے)

آپ فرماتے ہیں:

''عموی! یہ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ
دیں، تب بھی قسم ہے اس خدائے وحدہ لاشریک کے عزت و جلال کی جس
کے قبضے میں میری جان ہے کہ میں ہرگز ہرگز اپنے فریضہ تبلیغ و اعلان حق سے

منہ نہ موڑوں گا۔"

کارزار کفر و بطلان میں سوزش و برانگیختگی کی اک آگ سی لگ گئی کیوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کفر و گمراہی کے مقابلہ و مبارزہ میں حق و صداقت کی پیش کش فرمائی تھی اور اسلام نے کفر کا چیلنج قبول کیا تھا۔

اور اب شدائد و ایذا رسانی میں مزید تقویت پیدا ہوگئی۔ مکہ کا ذرہ ذرہ آپؐ کے خون کا پیاسا ہوگیا کیونکہ آپؐ اپنے مقام نبوت و استقامت سے بال برابر بھی ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے مگر یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ مخالفین کا تشدد بڑھا تو سرور کائناتؐ نے فریضہ تبلیغ کو بھی وسعت دے دی، ادھر سے پتھروں اور نجاستوں کی مار تھی اور ادھر تبلیغ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہا تھا، آپؐ نے قبائل عرب، تقریبات، بازاروں اور شاہ راہ عام پر جاجا کر فریضہ پیغمبری کی تعمیل اور سرفرازی اسلام کی جدوجہد شروع فرمادی، مورخین نے ان قبائل میں بطور خاص عذرہ، بنونفیر، بنو عامر، عبس، کندی، سلیم، حارث، مرہ، کعب اور بنو غسان وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن کریم حضور اکرمؐ کے ان تبلیغی اقدامات کا ان الفاظ میں تذکرہ فرماتا ہے کہ:

"قل[1] تعالو اتل ماحرو ربکم علیکم الا تشرکوابہ شیاءً وبالوالدین احساناً ج ولا تقتلوا اولاد کم من املاق. نحن نرزقکم و ایاکم ولا تقربو الفواحش ماظھر منھا و مابطن ولا تقتلو النفس التی حرم اللہ الابالحق ذلکم و صکم بہ لعلکم تعقلون. ولا تقربوامال الیتیم الابالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ واوفو الکیل و المیزان بالقسط. لانکلف

---

[1] یہ آیات مقدسہ ان چار آیات مقدسہ میں سے ہیں جو اسلام کے بنیادی و اساسی قوانین واحکام کا درجہ رکھتے ہیں اور سارا کا سارا اسلامی نظام حیات انہی حقائق عظیمہ پر محمول ہے (مصنف)

نفسا الاوسعها و اذاقلتم فاعدلوولو کان ذاقربیٰ وبعهدالله اوفواذلکم وصکم به لعلکم تذکرون و ان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه ولا تتبعو السبل فتفرق بکم عن سبیله. ذلکم وصکم به لعلکم تتقون. (الانعام ۱۵۳-۱۵۱، پارہ-۸)

ترجمہ : اے نبیؐ! ان نافرمانوں سے کہئے۔ آؤ، میں تمہیں اللہ کا پیغام سناؤں اور بتاؤں جو کہ تم پر تمہارے خدائے واحد و یکتا نے حرام کیا ہے، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدائے حیّ و قیوم کی کسی صفت میں کسی مخلوق کو اس کا سہیم وشریک نہ بناؤ اور بندگی ومحکومی کا سر عجز و نیاز خدا کی بارگاہ عزت وجلال کے سوا کسی غیر کی چوکھٹ پر نہ جھکاؤ اور والدین کے ساتھ احسان و نیکی کا برتاؤ کرو، اور اولاد کو پرورش و پرداخت اور مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو کیوں کہ رزق تو تمہیں بھی ہم ہی دیتے ہیں اور ان کو بھی ہم ہی دیں گے اور فواحش ومنکرات یعنی بے حیائیوں اور مکارہ اخلاق کے نزدیک بھی نہ جاؤ، یہ بے حیائیاں اور اخلاق سوزیاں ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور کسی (ایسی) جان کو قتل نہ کرو جسے قتل کرنا خدا نے حرام قرار دے دیا ہو، یہ باتیں ایسی ہیں کہ خدا نے تمہیں وصیت کی ہیں تا کہ تم دانش مندی اور بصیرت سے کام لو اور یتیموں کے مال کے قریب نہ جاؤ یعنی اس پر غاصبانہ قبضہ نہ کرو، سوا اس کے کوئی نیکی کی راہ ہو نگہداشت وتحفظ کے لئے اور یہ بھی اس وقت تک، جب تک یتیم سن شعور کو نہیں پہنچتا۔ اور ناپ تول (یعنی ہر معاملے کی تول) میں انصاف کے تقاضے پر پورے اترو۔ ہم کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتے۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو۔ تم کو یہ حکم (اس لئے) دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ اور بلاشبہ یہ میرا راستہ ہے اور (بلاخوف وخطر) سیدھا ہے۔ اس لئے اسی پر چلو۔ اور دوسرے راستوں پر مت چلو۔ وہ تم کو میرے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ حکم کر دیا ہے تا کہ تم بچتے رہو)

وحدہ لاشریک کے مذکورہ بالا ارشادات گرامی کی ہدایت آثار اور ضوبیز شعاعوں کے سبب جیسے جیسے حق روشن ہوتا گیا اور نبی اکرم کا حلقہ تبلیغ و اشاعت اسلام وسعت اختیار کرتا گیا، مخالفین اور معاندین کی طرف سے سخت گیریوں اور رکاوٹوں کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔

مگر کون تھا جو رسول من اللہ کو منزل من اللہ کے ابلاغ و اعلاء سے باز رکھ پاتا؟ عالم قدس میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق و محاسن کا گیت گایا جا رہا تھا کیونکہ یہ وہ مقام ابتلا و محن تھا جہاں اگلے انبیاء کرام کو بارگاہ احدیت میں مخالفین کی سرزنش کے لئے دعائیں مانگنی پڑی تھیں اور اسی مقام ابتلاء و محن پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ رافت و رحمت کی برکات و سعادات کے لازوال نقوش ثبت فرماتے نظر آتے ہیں اور وحی الٰہی کا پیہم نزول و صدور آپ کے پائے استقامت و قوت عمل میں اور زیادہ مضبوطی پیدا فرماتا ہے۔

فذلک فادع و استقم کما امرت ولا تتبع اھوائھم وقل امنت بما انزل اللہ من کتاب وامرت لاعدل بینکم اللہ ربنا و ربکم الخ

(پارہ-۲۵)

ترجمہ: پس اسی طرح آپ انہیں (اسلام کی) دعوت دیجئے اور استقامت اختیار کیجئے جیسا کہ میں نے حکم کیا اور آپ ان کی خواہشوں کے تابع نہ ہوں بلکہ فرما [illegible]

غور تو کیجئے! محکومی و بندگی کا کتنا عدیم المثال نمونہ اس ذات اقدس کے اقدام و عمل سے پیش ہوتا ہے اور مامور من اللہ کی حیثیت عظمی پر کتنی روشن اور صاف دلیل پیش

کی گئی ہے۔ دراصل پیغمبرانہ کردار و عمل میں سب سے زیادہ تعمق فکر و نظر کا یہی مقام ہے جو صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد والوں کے لئے بھی شمع ہدایت و سعادت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور حقائق عقائد کی وابستگیوں میں ضم ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے صدہا مقامات پر ان پہلوؤں پر صاف صاف روشنی ڈالی ہے اور یہ نکتہ یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ حضور اکرمؐ ابتدا میں نشانہ ابتلا و محن بھی ہوئے اور پھر جاء الحق وزھق الباطل و الباطل کان زھوقا (حق آیا اور روشن ہوا اور باطل فنا ہوا اور باطل کو تو فنا ہونا ہی تھا) کے مصداق بن کر صفحہ گیتی پر انتہائی ضوریز و شفاف اور تابناک ستارے کی طرح روشن بھی ہوئے، مگر تاریخ اسلام میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنے آپ کو فوق البشر بتلایا ہو، قرآن فرماتا ہے:

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی۔ (آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔)

قیامت کے متعلق بھی جب آپ سے کفار و مشرکین پوچھتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں "انما علمھا عند ربی لایجلیھا لوقتھا الا ھو (بیشک اس کا علم اللہ کو ہے وہ وقت مقررہ پر اس کو معرض وجود میں لائے گا) غور کرنے کی بات ہے کہ راز دار کن فیکون اور حامل اسرار ازل اپنی بندگی و محکومی کا ایک ایسا مظاہرہ پیش فرماتا ہے کہ اس سے بہتر بندگی کی کوئی دوسری مثال صحیفہ فطرت میں نہیں ملتی۔ اللھم صلی وسلم علیہ و علی الہ الکرام.

ہلاکت آفریں مہمہ شدیدہ مقاطعہ مہلکہ

سات سال تک مسلسل آلام و مصائب اور جور و ستم کے بعد بھی جب سنگ دلان مکہ اپنی شرارت پسندیوں کا کوئی کامیاب اثر نہ دیکھ سکے تو ان کے کارخانہ کفرو

ظلمت میں ہیبت ناک سراسیمگیاں پیدا ہوگئیں کیونکہ جس آواز کو وہ دبانا چاہ رہے تھے اس کے اثر ونفوذ کا دائرہ بجائے نسیاً منسیاً ہونے کے اب اور زیادہ وسعت وثبات اختیار کر گیا، قریش کے معزز خاندانوں میں بنو ہاشم اور بنو عدی کے ممتاز وشجاع افراد حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ طرح طرح کی صورتیں زیر غور آنے لگیں، مجلس مشورت کے ہنگامی جلسوں میں ہر تجویز کا فکر وتدبر کے ساتھ تجزیہ کیا گیا کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اعلانیہ قتل بنو ہاشم سے جنگ مول لینے کے مترادف تھا، بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ خاندان نبوت کے تمام افراد کو محصور ومقید کر کے ان کے اسباب حیات کے تمام راستے قطعی طور پر مسدود کر دیئے جائیں اور مقاطعہ اتنا سخت ہو کہ اس قید ومحاصرہ سے ہمارے خداؤں کو باطل کہنے والے جاں بر نہ ہوسکیں، رزق کا کوئی دانہ اور پانی کا کوئی قطرہ جینے میں معاون نہ ہو، سارے کے سارے قبائل مکہ ان ہلاکت آفرینیوں میں عملی طور پر شریک ہوں تاکہ ایک بنو ہاشم سب سے لڑائی مول لینے کے خوف سے مزاحمت ومجادلت کی جرأت نہ کریں۔

اس ہلاکت آفریں معاہدہ کی ترتیب وتسوید میں سارے قبائل شریک ہوئے اور تمام قبائل مکہ کے علاوہ بنو ہاشم کے دستخط بھی کرا لئے گئے اور ایک پر جوش نوجوان نے در کعبہ پر اس مظلوم اعظمؐ کے خلاف مقاطعہ کا اعلان نامہ چسپاں کر دیا عالم قدس پر حیرت واستعجاب کا سکتہ طاری تھا کہ جو دعائے ابراہیم اور نوید عیسیٰ بن کر دنیا میں مبعوث ہوا تھا اور جو حفاظت ومرتبت کعبہ کا ذمہ دار بنا کر مبعوث کیا گیا اور جس کے مبارک ظہور کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں شوق ومحبت کی دعائیں مانگیں آج اس انسان کامل کی ہلاکت وبربادی کا اعلان نامہ چسپاں کیا گیا ہے۔

لیکن خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مجلی جو مورد اسرار ازل تھا، پرسکون وپراطمینان تھا کیونکہ درون قلب سے بار بار کوئی نغمہ دل نواز ومحبوب نواز لبریز

کیف و کم دولت سرائے قلب حسن و جمال پر واردو صادر ہو رہا تھا اور دوست کی آواز محبت کی لذائذ بخششیوں کا حسین تحفہ پیش کر رہی تھی۔

یا ایھاالنبیؑ حسبک الله ومن اتبعک من المومنین

اے میرے نبیؐ! آپ کا اللہ آپؐ کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو آپ کے پیچھے ہیں مومنین میں سے، کافی وبس ہے!

حضرت ابوطالب نے سوچا معاملے کی نزاکت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور مکہ والوں کی شرارتوں کا ہیبت ناک طوفان بنو ہاشم کے کاشانہ حق وصداقت کے سر پر آ چکا ہے۔ لیکن حالات جتنے بھی ناموافق ہوں ابوطالب اس کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھے کہ چہیتے بھتیجے کو تنہا ان ہلاکت آفرینیوں سے نپٹنے کے لئے چھوڑ دیں۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب سوا چند پریشان حال مخلصین کے مکہ کا بچہ بچہ محمدؐ بن عبداللہ کا دشمن بنا ہوا تھا، ایسے میں بنو ہاشم کے باوقار بزرگ جناب ابوطالب کفر وایمان کے بیچ سد راہ تھے، اور خدا جو منصف حقیقی ہے پتہ نہیں ابوطالب کے حق میں یوم الوعید کو کیا حکم صادر فرمائے گا مگر حالات و واقعات کا صحیح مطالعہ کرنے والے اس محسن اسلام کو خراج تشکر و تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شعب ابوطالب

تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوطالب عزم مجاہدانہ کے ساتھ اپنے چہیتے بھتیجے اور دوسرے افراد خاندان کے ساتھ اپنے ایک مکان میں (جو دامن کوہ میں واقع تھا) منتقل ہو گئے، مشرکین نے چاروں طرف سے اس مکان کا محاصرہ کر لیا اور اسباب وسائل کے تمام راستے ایک ایک کر کے مسدود کر دیئے گئے کیونکہ محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قیمتی جان مطلوب تھی اور اس کے حصول کے لئے شقاوتوں کی کوئی ایسی شق نہ تھی جو

معرض عمل میں نہ لائی گئی۔

اولئک الذین اشترو الضلالۃ بالھدی

بدبختیوں نے ہدایت وسعادت کے عوض گمراہی خریدی تھی، خاندان نبوت پر تباہی اور ہلاکت کی کوئی ایسی حالت نہ تھی جو ان ایام قید و بند میں ان پر نہ گذاری ہو، سعد ابن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ ایک رات یہ نوبت پہنچ گئی کہ ایک سوکھا ہوا چمڑا آگ پر بھون کر کھایا گیا (روض الالف)

تین سال تک قید و بند کی اس ہولناکیوں کو برداشت کرنے کے بعد بھی سکون و اطمینان نصیب نہ ہوا اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بنو ہاشم نے ان تین سالوں میں جس استقلال و پامردی کا مظاہرہ کیا اس کی مثال تاریخ میں تلاش کرنی ممکن نہیں، بچوں کا بلکنا، جوانوں کا نڈھال ہونا، اور اعزہ واقربا کا اضمحلال اور انتشار و انفعال، انسانی زندگی کا یہ وہ نازک مقام ہے جہاں حوصلوں کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے لیکن اللہ کے حبیبؐ نے حق وصداقت کی راہ میں جو قدم آگے بڑھادیا تھا اس کے پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا لہٰذا حضورؐ نے اپنی پوری الٰہی طاقتوں کے ساتھ اعلان فرمادیا کہ میں نے تبلیغ اسلام کا جو مبارک کام شروع کیا ہے اس سے ہرگز ہرگز باز نہیں آسکتا چاہے اس سلسلے میں مجھے جان عزیز کا سودا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اور ان مراحل میں سب سے زیادہ سبق آموز سانحہ یہ ہے کہ مصائب و شدائد اور ایذاء رسانیوں کی انہی شباب آگیں گھڑیوں میں، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چاہنے والے چچا کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، وہ رخصت ہو گئے، اور صرف حضرت ابوطالب ہی نہیں بلکہ شریک درد وغم رفیقہ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا لیکن محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پائے

ثبات واستقامت میں لغزش نہ آئی کیوں کہ ملکوتی صبر وجلال اپنی ساری تابنا کیوں کے ساتھ قلب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو گرما چکا تھا لہٰذا کون تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جادۂ استقامت فی سبیل اللہ پر جادہ پیا ہونے سے روک پاتا، قرآن مجید فرماتا ہے۔

ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون.

شان اقدس واعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ مرتبتی کا کیا کہنا کہ اس آیت میں تو ایک عام بشارت دی جارہی ہے کہ جو لوگ خدائے حیٔ وقیوم کو حقیقی معنوں میں رب تسلیم کرکے اس پر جم گئے اور کسی حال میں ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی ان کے لئے یہ بشارت ہے کہ ان پر کوئی خوف اپنا کام نہیں کرسکتا اور کسی سے ان کو نقصان نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی استقلال وثبات کے ان شیدائیوں کی زندگی میں یہ کیفیت پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی مخالفت وایذا اور گردش ایام کے کسی ناموافق اثر سے غمگین واندوہ گیں ہوں۔

لہٰذا دنیا نے دیکھا کہ شدائد اور ایذا رسانیوں کا تسلسل قائم رہا مشرکین مکہ اپنی طاغوتی طاقتوں کے بروئے کار لانے میں طرح طرح کی ترکیبیں پیدا کرتے رہے، کبھی بچوں سے نبی اکرمؐ پر سنگ باری کرائی جاتی ہے، کبھی نماز پڑھتے ہوئے پشت مبارک پر اوجھڑال دی جاتی ہے اور کبھی رہ گذار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں، بہیمیت وسفاکی کا افسوس ناک مظاہرہ کیا جاتا رہا اور اسی درمیان چہیتے چچا حضرت ابوطالب غفر اللہ لہ اور حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غم جدائی دے گئیں مگر وادی غیر ذی زرع کا ذرہ ذرہ گواہ ہے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ساری کی ساری ہولنا کیوں اور نامساعدتوں سے کبیدہ

خاطر ہونے کے بجائے صبر واستقامت فی اللہ وعلی اللہ کا عدیم المثال نمونہ پیش فرماتے ہیں اور ہزار ہا ہزار ناموافقتیں بھی آپ کو ہراساں اور پریشان نہ کرسکیں۔

آپؐ نے اس راہ حق وصداقت میں ہر کانٹے کو پھول سمجھ کر اپنا کام کرنے اور راہ کی ہر سختی وتنگی کو آسانی ووسعت سمجھ کر آگے آنے دیا۔ دنیا کو آج تک اس کا اعتراف ہے اور قیامت تک اس کا اعتراف کیا جاتا رہے گا کہ جیسے جیسے اعلاء کلمۃ الحق میں سختیاں سدراہ بنتی جاتی تھیں ویسے ویسے اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب عالم تاب بن کر اپنی نورانی کرنوں سے تیرگی عالم کو محو فرماتا جاتا تھا اور وحی الٰہی اسوۂ محمدی صلعم کو روشن فرماتی جاتی تھی۔ حالانکہ تمرد وسرکشی کا ہر مظاہرہ اپنی سنگینیوں میں یکتا تھا اور ضلالت و شقاوت کے متوالے اس اعلان حق کو ناکام بنانے میں جو کچھ کر سکتے تھے پوری پامردی کے ساتھ کر رہے تھے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت واستقامت لایزال اپنی پوری سرگرمیوں کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام کے اعلاء وتبلیغ میں مصروف ومنہمک تھی کیونکہ منطوق خداوندی ہر لحہ قلب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر وارد وصادر ہو رہی تھی اور تائید الٰہی کی تمام غالب کارفرمائیاں آپ کے قدم قدم پر نچھاور ہو رہی تھیں اور جلال وحی پکار پکار کر کہہ رہا تھا:

ماانت بنعمته ربک بمجنون وان لک لااجراً غیر ممنون وانک لعلی خلق عظیم۔ (سورہ نون۔ پ۲۹)

(ترجمہ: یہ جھوٹے بدبخت حقیقت ناشناسی کی لعنت میں مبتلا ہیں ورنہ آپ اس اعلاء فضل ونعمت الٰہیہ میں مجنون نہیں ہیں اور یقیناً آپ کے لئے قرب خداوندی کے جو اعلیٰ مدارج ہیں وہ کسی اور وسیلہ وتوسل کا نتیجہ نہیں، اور آپ کی رسالت عظمٰی کسی دوسرے کی رہین منت نہیں، اور یہی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی حقیقت خلق عظیم پر ہے)

ان حقائق کے پیش نظر یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ مکہ کی پرشور زمین پر

شجر اسلام کا برومند ہونا یقیناً اس کی تاریخ وتمدن کے خلاف تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور یہی آپ کی خصوصیت کبریٰ ہے۔

ابوجہل کی مہلکہ پرداز شقاوتیں آپ اپنی مثال ہیں، مگر اسلام کی تبلیغ کی راہ میں وحی خداوندی کا چراغ جگمگا رہا تھا۔ قم فانذر۔ اے محمدؐ! کھڑے ہو جاؤ اور بے دھڑک بدکرداریوں اور کفر وشرک کی ناپاکیوں سے لوگوں کو ڈراؤ۔ لہٰذا آپ کے اقدام و عمل میں اور زیادہ استقلال وتیز رفتاری نمودار ہونے لگی۔

تین سال کا جان لیوا محاصرہ، حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا صدمہ ارتحال، مخالفتوں اور ایذاء رسانیوں کا دباؤ اور مدافعات ومہلکات کے متعدد منصوبے ...... ان میں سے ایک بھی نبی کریم فداہ ابی وامی کو راہ حق سے پیچھے نہ ہٹا سکا اور آپ نے اپنی تمام تر مبارک توجہات کو تبلیغ اسلام پر مرکوز فرما دیا، بدبختانِ طائف کے اوباش منش افراد کا معصوم انسان کامل واکمل صلی اللہ علیہ وسلم کو لہولہان کر دینا (زرقانی) دنیا کی بڑی بڑی بدبختیوں اور ناہنجاریوں کا مقدمہ ہے لیکن کون ہے جو حضور فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اتہام لگا سکے کہ آپؐ نے راہ حق وصداقت میں آفات ومصائب کے ہر کانٹے کو سینہ اقدس سے نہ لگایا اور ان مصائب پر قابو حاصل کرنے کے سوا (معاذ اللہ) کبھی سکوت عن الحق وقیام حدود اللہ واعتصام بحبل اللہ سے تنگی قلب ونظر کا ثبوت دیا۔

سوچو تو! مکہ کے سرکش معاندین ومشرکین حملہ کی کارروائیوں میں مصروف و مشغول ہیں، بچہ بچہ آلات حرب کی تیاریوں میں سرگرم عمل ہے، کفار ومشرکین کا فیصلہ ہے کہ اب محمدؐ بن عبداللہ کے خاتمہ کے بغیر سکون واطمینان محال ہے لہٰذا سرخیل اعداء اسلام ابوسفیان وابوجہل کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تمام تدابیر زیر عمل ہیں اور وقت مقرر ہے کہ نعوذ باللہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام ہی کر دیا جائے مگر دنیا نے دیکھا کہ دانائے راز صلی اللہ علیہ وسلم ہشاش بشاش دولت کدہ نبوت سے عارضی طور پر

منتقل ہو کر آماجگہہ ہدایت وسعادت (مدینہ منورہ) کی جانب سفر فرما ہو جاتے ہیں اور اس طرح کفار واشرار مکہ کے سارے کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے کیونکہ کارساز ازل نے آپ کو بشارت دی تھی کہ

یریدون ان یطفؤ نورا لله بافواههم والله متم نوره ولو کره المشرکون.

(ترجمہ ومطلب: اگر چہ بدبختان مکہ ان ناپاک کوششوں میں مصروف ہیں کہ اللہ کے نور (قرآن اور ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی پھونکوں (ناپاک کوششوں) سے بجھادیں (اسلام کو پھیلنے نہ دیں) لیکن اللہ اس نور کو درجہ تکمیل وعروج پر پہنچانا ہی پسند فرماتا ہے، اگر چہ ان بے ایمانوں کے لئے یہ بات بڑی مکروہ اور تکلیف دہ ہے)

غور کرو صرف یہ ایک آیت مقدسہ کتنی بخشش وعطا اور قوت وحقیقت کی حامل ہے، قرآن کہتا ہے کہ اسرار ورموز الٰہیہ اور حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پردۂ ازل سے منصۂ شہود پر تاباں اور درخشاں ہوگئی تو ان باطل شعاریوں سے اسے ختم کرنے کا منصوبہ اور تکمیل دین کی راہ میں کفر وضلالت سے رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کوئی حقیقت نہیں رکھتی قرآن فرماتا ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ ساری ناپاک تگ ودو جو اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے مشرکین وکافرین کی طرف سے بروئے عمل آرہی ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ ان کی مثال ہوائی قلعہ کی ہے۔

هوالذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله و لو کره المشرکون۔

(وہ جس نے اپنے رسولِ اکمل کو مبعوث کیا ہے، ہدایات وسعادات کی تمام کی تمام صداقتوں کے ساتھ اور دین حق کا حامل ومبلغ بنا کر، اس کی مرضی ومنشا یہ ہے کہ تمام

ادیان باطل پر اس دین حق کو غالب فرما دے اگر چہ یہ غلبہ و اقتدار مشرکین کے لئے تکلیف دہ ہے)

وحی خداوندی کی یہ ودیعتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہ تھکا دینے والی قدوسی طاقتوں سے سرشار کئے تھیں، اول اول جو آوازۂ حق و صداقت جبل بوقبیس کی چوٹی سے بلند ہوا تھا اور جو آفتاب نور و ہدایت حضرت آمنہ کے دولت کدہ نور سے طلوع ہوا تھا اس کی کرنیں ابر و باد کی ناموافقتوں سے نپٹتی ہوئی اور کفر زار مکہ کی ہلاکت آفریں اور قہر ساماں بجلیوں کا مقابلہ فرماتی ہوئی، ظلمت کدۂ عالم کو پرنور کرتی جاتی تھیں، کفر کی اندھیریاں ماند پڑ رہی تھیں اور محمد الرسول اللہ صلعم کا ولولہ ابلاغ و ہدایت اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھرتا جاتا تھا۔

اور پھر زمانے نے دیکھا کہ فرزندان اسلام کی ایک مختصر سی جماعت نے انسانیت کبریٰ کی تعمیل و تشکیل کے ایک ایسے ضابطہ و نظام کو اپنی زندگیوں میں کارفرما کر دکھایا جو سرتاسر الٰہی نظام تھا اور جس کی اساس و بنیاد و ماینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی پر تھی۔

ہجرت اولیٰ:

چمن زار ملت ابراہیمی کی اس اساس و بنیاد کی ساری کی ساری گل ریزی و برومندی اس ذات قدسی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ربانی طاقتوں کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہے جس نے نوع انسانی کی فوز و فلاح کے لئے اپنی جان عزیز (جو مبدأ خلق اور مصدر موجودات تھی) کفر و باطل کی ہلاکت خیزیوں کے سپرد فرما دی مگر حق و صداقت کے اعلان سے باز نہ آئے، ایسا اس لئے ہوا کہ خود قرآن کریم کے الفاظ میں قل یاایھاالناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الخ (پارہ-۹)

(اے نبیؐ آپ فرما دیجئے کہ میں تمام نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں)

دوسری جگہ کہا جاتا ہے:

وماارسلنک الا کافتہ للناس بشیراونذیراً.

(اور سوا اس کے کوئی دوسری بات نہیں کہ ہم نے آپ کو ساری نوع انسانی کی ہدایت کے لئے بشیر ونذیر بنا کر مبعوث کیا)

پس سرزمین مکہ برکت وسعادت ازلی کا مورد ہے کہ اللہ نے اپنی خلافت و نیابت کا تاج رسالت زیب سر اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما کر اپنے اتمام افضال وکمال کے لئے ظہور فرمایا اور ان پر جان دینے والے (**والسابقون الاولون من المهاجرین والانصار و الذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنه ورضوعنه** الخ (پارہ-۱۱)) سابقین اولین جنہوں نے مشرکین مکہ کی بے رحمانہ اور انسانیت سوز بلاخیزیوں کو صبر واستقامت کی ایمانی قوتوں سے مغلوب کر دیا، مہاجرین وانصار شمع رسالتؐ کے وہ پروانے ہیں جو خدا کی راہ میں ایک بار قدم رکھ دینے کے بعد دنیا کی ساری فرعونی اور طاغوتی قوتوں کے سامنے سینہ سپر رہے لیکن جادۂ اسلام سے ان کا کوئی قدم پیچھے نہ ہٹا اور جن لوگوں نے ان شیفتگان ہدایت کی بیعت قبول کی یہ وہی سعادت مندان کاشانہ نبوت ہیں جن کی جاں سپاریاں خدا کو خوش کر گئیں اور جو مواعید الٰہیہ کے اتمام افضال ونعم کے سبب خوش بختان ازلی میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ان مٹھی بھر نفوس قدسیہ میں اسلام کا اعلیٰ ترین نظریہ حیات اس شدومد کے ساتھ غالب وکارفرما تھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس رہ کر بھی وہ کبھی کسی غیر خدا سے مرعوب نہ ہوئے اور ان کی زبان حق گو کو حق و صداقت کے اظہار میں تخت وتاج کا نمائشی رعب ودبدبہ بھی مرعوب نہ کر سکا کیونکہ ان کا وجدان شارع اسلام کے بخشے ہوئے اس جرعہ صدق سے سرشار رہتا تھا کہ:

افضل الجهاد کلمته حق عند سلطان جابر (رواہ الترمذی وابن ماجہ)
(ظالم حکمراں کے سامنے حق کا اظہار بہترین جہاد ہے)

اظہارحق وصداقت کی ایک بہترین مثال ہمیں خدا پرستوں کے اس قافلے میں ملتی ہے جو شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں پہنچا تھا، امیر قافلہ اسلام حضرت جعفر بن ابی طالب سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کرتے ہیں اور نجاشی پر رقت طاری ہوجاتی ہے (یہ خلاف توقع اور حوصلہ شکن منظر دیکھ کر) مخالفین اسلام کا وہ گروہ جو مسلمانوں کو وہاں سے شہر بدر کرانے کی غرض اور تمنا لے کر حبشہ پہنچا تھا، نجاشی سے کہتا ہے "ذرا آبائی دین سے انحراف کرنے والے ان مسلمانوں سے حضرت عیسیٰ کے متعلق تو پوچھئے۔"

اس سوال کی غرض یہ تھی کہ اہل حبشہ مذہبا عیسائی تھے اور مخالفین اسلام سمجھتے تھے کہ ان مسلمانوں نے اگر نجاشی اور اس کی قوم کے عقیدہ ابن اللہی کی تکذیب کی تو انہیں بہ آسانی حبشہ سے نکلوایا جاسکے گا اور اگر انہوں نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کیا تو ان کی منافقت اور دورخے پن کا شہرہ کیا جاسکے گا کیونکہ ان کے نبیؐ حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ نہیں مانتے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حضرت جعفرابن ابو طالب نے وہی فرمایا جو خدا اور خدا کے نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو پہنچا تھا (مسند امام احمد ابن حنبل)

گذشتہ صفحات میں بیان کئے گئے تمام واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی جب بہیمیت و بربریت کی شرم ناک منزل پر اپنی بدکرداریوں کا بھیانک ڈرامہ کھیل رہی تھی اور معاشرے میں حسنِ اجتماعی کے فقدان نے انسانیت نواز خصوصیتوں کو انسانی ذہن سے محو کردیا تھا تو ایک انسان کامل واکمل نے ہدایت وسعادت کی شمع ہاتھ میں لے کر بھٹکی ہوئی انسانیت کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے محاسن اخلاق کے ان تمام بلند تقاضوں کو اجاگر کیا جو نوع انسانی کو حیات کبریٰ کی بہرہ مندیوں سے روشناس کراسکیں

اور ارذل ترین خصائص بہیمیت وحیوانیت کی ان ناپاکیوں کا استیصال کرسکیں جو اس وسیع مملکت الٰہی پر اشرف ترین مخلوق کو جانوروں کے مشابہہ کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حیات کبریٰ کی خصوصیت کبریٰ قرآن اور شارع اسلام کی زبان میں کیا قرار دیا جاسکتا ہے؟

راقم الحروف کے خیال میں یہ خصوصیت کبریٰ خدا پرستی اور ایمان سے تعبیر کی جاسکتی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے

ان الشر الدواب عندالله الذین کفر و فھم لایومنون (پ-۱۹)

(یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہی ہیں جنہوں نے کفر کیا اور خدا اور رسول پر ایمان نہیں لائے)

دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے:

ان الشر الدواب عندالله الصُمُّ البکم الذین لایعقلون (پارہ-۹)

بیشک اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ گونگے اور بہرے ہیں جو عقل و شعور سے کام نہیں لیتے)

قرآن کریم کی ان دو آیات مقدسہ پر اگر بلیغ فکر ونظر سے کام لیا جائے تو بہت سے باطل شکوک و اوہام سے نجات حاصل ہو جائے اور یہ تسلیم کر لینے میں کوئی دشواری نہ ہو کہ جب خدا ایمان نہ لانے والوں اور کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو بھی بدترین جانور کہہ رہا ہے اور عقل سے کام نہ لینے والوں کو بھی بدترین جانور قرار دے رہا ہے تو گویا عقل و شعور کی انتہائی بالیدہ اور ترقی یافتہ منزل فرمانِ خداوندی کے مطابق اقرار و ایمان توحید و رسالت ہی ہے اور دوئم یہ کہ جو ایمان لانے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر باطل قسم کے اوہام میں گھرا ہے اور عقل و شعور سے کام نہیں لیتا وہ گویا ابھی تک ایمان کی اصل لذت سے لطف اندوز نہیں ہو سکا اور اس کے اصل ثمرات تک

اس کی رسائی نہیں ہو سکی۔

شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھٹکے ہوئے اور اوہام باطلہ کی ظلمت میں گھرے ہوئے انسانی قافلہ کو اسی روشن راہ کی طرف آنے کی دعوت دی تھی اور دراصل اسلام کے فتح و کشاد کی یہی کنجی ہے جسے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں سپرد فرمایا گیا۔

عقل و شعور کے معیار پر بہترین طریقِ حیات

اس پس منظر میں (جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے وہ اللہ کے نزدیک گونگے اور بہرے ہی نہیں بلکہ بدترین اور ناپاک جانور کی طرح ہیں) یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی عقل سلیم اور اس کے فہم و ادراک کو ایک بہترین طریق حیات کی طرف بلاتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ ان الدین عند اللہ الاسلام ۔ پ-۳ (بیشک اللہ کے نزدیک دین (بہترین طریق حیات) اسلام (کی پیروی میں پوشیدہ) ہے)

افکار و آراء کی تلبیث و تلوث نے جو رنگ و روغن بھی پیدا کیا ہو لیکن اسلام کا اصلی رنگ و روغن وہی ہے جو کتاب اللہ میں محفوظ ہے اور اشخاص و افراد کے اقوال و افعال اور آراء و قیاس نے اختلاف و افتراق کی جو صورتیں بھی پیدا کی ہوں لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ان کا کوئی اثر اسلام کے اصلی خدوخال کو متاثر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خداوند ذوالجلال نے لے رکھا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر و اناله لحفظون (پ-۱۴)

(ہم نے یہ ذکر حقیقت و صداقت یعنی قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا جاتا ہے:

الیوم اکملت لکم و دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (پ-٦)

(میں نے آپ پر (بہترین اور ترقی یافتہ) طریق حیات مکمل (طور پر نازل) کر دیا اور اپنی تمام نعمتیں (ہدایت وسعادت اور فلاح کی جو میں وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کو دیا کرتا تھا) آپ پر تمام کر دیں اور آپ کے لئے اسلام کے طریق حیات کو پسند کیا)

پھر ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا جاتا ہے:

ومن یبتغ غیرالاسلام دینا فلن یقبل منہ وھوفی الاخرۃ من الخاسرین (پارہ-٣)

ترجمہ: اور جس نے بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین پسند وقبول کیا تو اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ سارا کا سارا کارخانہ کفر و ضلالت اپنی تخریبی سرگرمیوں میں سرگرم کار تھا اور ویسے روح فرسا، اذیت ناک، گناہ پرور اور حق ناآشنا ماحول میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدائے ذوالجلال والکرام سے بغی وسرکشی اختیار کرنے والوں کو فوز وفلاح اور ہدایت وسعادت کی راہ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ اور دعوت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس دعوت کا مقصد اگر یہ تھا کہ وہ نیکی اور خیر کی طرف پیش قدمی کریں تو وہیں اس کا واضح نتیجہ یہ بھی نکلنے والا تھا کہ اپنے اباء واجداد کے غلط طریقوں کو چھوڑ دیں، کفار مکہ کے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی، نیکی اور حق وصداقت ان کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی تھی اور اپنے آبائی غلط اور باطل طریقوں کی حفاظت نگرانی اور پیروی

کوانہوں نے اول درجہ دے رکھا تھا۔

نتیجتاً محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شدائد ومصائب کا پہاڑ توڑنے کا منصوبہ بنایا گیا اور مشرکین مکہ نے اپنے جانتے اس منصوبہ پر پوری طرح عمل بھی کیا، اس گھناؤنے منصوبے اور عمل کے کچھ نمونے گذشتہ صفحات میں پیش کئے گئے جن سے اس آزمائش کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقا (والذین مَعَهُمْ) کو گذرنا پڑا مگر تاریخ شاہد ہے کہ کفار کے سارے منصوبے ہوا میں بنایا محل ثابت ہوئے اور آخرکار فتح مکہ کا مبارک اور سعید دن مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ بنا جس دن بارگاہ رب العزت سے یہ فرمان جاری ہوا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

(آج ہم نے آپ پر آپ کا دین مکمل کردیا اور اپنی تمام نعمتوں کا آپ پر اتمام کردیا اور آپ کے لئے اسلام کے بہترین طریق حیات کو پسند کیا)

معلوم ہوا کہ سارے شدائد ومصائب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی لئے گزرنا پڑا کہ وہ کافروں اور مشرکوں کو اسلام کی طرف بلا رہے تھے اور تاریخ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جو اسلام لے آئے وہ دین اور دنیا کی تمام سرافرازیوں سے سرخ رو اور سرفراز کئے گئے۔

لہٰذا آج بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو دین حق اور بہترین طریق حیات کے لئے جدوجہد کرے گا اور شدائد ومصائب سے مرعوب ہوکر غلط اور غیر اسلامی طریق حیات کی طرف رجوع نہیں کرے گا، کامیابی اور کامرانی اسی کے لئے ہے۔

ولاتھنوا ولاتحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنون۔

(ہراساں اور پریشان مت ہو، کامیابی تمہارے ہی لئے ہے اگر تم مومن ہو)

اس آیت کی روشنی میں باضابطہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان ہونے کا مطلب کامیاب ہونا ہے، اور یہی آیت کیا متعدد جگہوں پر ایسی بشارتیں موجود ہیں جن کی روشنی میں بہت اطمینان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان دنیا یا دین کسی جگہ بھی ناکام نہیں ہوگا، اس سلسلے میں چند آیات کریمہ ملاحظہ ہوں:

(۱) **بلی من اسلم وجهه لله وهومحسن فله اجره عندربه ولاخوف عليهم ولا هم يحزنون۔** (البقرہ۱۱۲، پارہ-۱)

(ہاں جس نے اپنا رخ اسلام اور خدا کی تابعداری کی طرف کرلیا اور وہ (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے والا ہے تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس (نیک) بدلہ ہے اور ایسے (مسلمانوں) کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

(۲) **الذين ينفقون اموالهم فى سبيل الله ثم لايتبعون ماانفقوامنا ولا اذى لهم اجرهم عند ربهم ولاخوف عليهم ولاهم يحزنون۔** (البقرہ۲۶۲، پ-۳)

(جولوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کی راہ میں اور پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کوئی احسان جتاتے ہیں نہ ہی کسی کو (مالدار ہونے کے سبب) ستاتے ہیں تو ایسے لوگوں کو کوئی خوف نہیں ہے اور کبھی غمگین نہیں ہوں گے)

(۳) **لکن الرسول والذين آمنوا معه جهدوابامو الهم وانفسهم واولئک لهم الخيرات واولئک هم المفلحون** (التوبۃ ۸۸، پ-۱۰)

(لیکن رسول اللہ اور جوان کے ساتھ ایمان لائے، جہاد کیا اپنے مال اور نفس سے۔ تو اسی کے لئے (دین اور دنیا دونوں جگہ) نیکیاں اور اچھائیاں ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

(۴) سخرلکم مافی السموت ومافی الارض جمیعا.
(زمین وآسمان میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لئے مسخر کردیا گیا ہے)

(۵) الذین آمنو اوکانو یتقون. لهم البشری فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة.
(جو لوگ کہ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لئے دنیا اور آخرت (دونوں جگہ کامیابی) کی بشارت ہے)

(۶) ان الارض یرثها عبادی الصالحون.
(بیشک زمین تو صرف صالح بندوں کی وراثت ہے)

(۷) استغفرو ربکم انه کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال وبنین و یجعل لکم النهارا (سورہ ۷۱، رکوع اول- آیت ۵)
(گناہوں کی معافی مانگو اپنے پروردگار سے کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار مینہہ برسائے گا۔ مال اولاد سے تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے لئے جنت پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا)

(۸) نصرمن الله وفتح قریب و بشرالمومنین. (پ-۲۸، الجمعۃ-۱۳)
(اللہ کی طرف سے مدد (کا وعدہ) اور فتح قریب (ہے) اور بشارت ہے مومنین کے لئے)

(۹) ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شی وهدیٰ ورحمته وبشری للمسلمین (پ ۱۴، النحل ۸۹)
(اور آپ پر ہم نے کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا کھلا بیان ہے (اور اس

کتاب کی رو سے) رحمت و بشارت مسلمانوں کے لئے ہے۔

(۱۰) وعدالله لایخلف الله وعده ولکن اکثرالناس لایعلمون

(پ-۲۱،الروم-٦)

(مسلمانوں کی کامیابی) اللہ کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا مگر اکثر لوگ یہ جانتے نہیں)

مذکورہ بالا تمام آیات قرآنی اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام نام ہے دین دنیا دونوں عالم میں سرفرازی و سرخ روئی کا، اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمام عالم کی آنکھوں کا تارا بن کر رہیں اور کوئی پریشانی کوئی شکست اور کوئی ناکامی ہمارا مقدر نہ بنے۔ مگر صورت حال تو اس سے بالکل مختلف ہے۔

پیش منظر:

۱۸۵۷ء تک کے مسلم ہندوستان کی خوں چکاں تاریخ کو اگر ہم فراموش بھی کر دیں تب بھی ۱۸۵۷ء سے آج تک جو ہزیمت و شکست مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی یہ خود اپنے آپ میں ایک الگ داستان ہزار حسرت آیات ہے، بہادر شاہ ظفر کی معزولی، انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں پر عرصہ حیات کا تنگ کیا جانا، متعدد مسلم نوابوں راجاؤں اور تعلقہ داروں کی جائدادوں کی ضبطیاں، مچھلی بازار کانپور کی مسجد کی شہادت، اور پھر ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے روح فرسا اور خوں چکاں واقعات اور آزادی کے بعد مسلسل فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ اور ان میں سے تقریباً ہر ایک میں مسلمانوں کی کھلی ہزیمت اور جانی و مالی نقصان، اجتماعی طور پر ان کے تئیں دوسروں کا تحقیر آمیز رویہ، نوکریوں میں ان کا فقدان، ان کی مالی زبوں حالی، ان کے علاقوں میں گندگی و پراگندگی کے نشانات پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ پچھلی کئی صدیوں سے مسلمان

قرآن کریم کی بشارتوں کا مصداق نہیں بن رہا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ اب کبھی شام وسحر کی رنگین دل آویزیاں واپس نہ آسکیں گی اور یہ اندھا دھند تخریبی سازشیں بخیال خام مسلمانوں کی معاشرت، تمدن اور مذہب واخلاق کے دھارے کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو جائیں گی!

سوال ہزار دو ہزار کا نہیں کروڑوں انسانوں کے اس عظیم گروہ کا معاملہ ہے جو جماعتی اکائی سے کسی ملک کی فطرت بنانے اور بگاڑنے کی فطری صلاحیتوں سے ہمکنار ہے، جس کے دامن سعادت میں ایک عالمگیر بین الانسانی صالح ترین نظام زندگی کی پاکیزہ تر امانتیں جلوہ ریز وگہربار ہیں، تاریخ ارتقا شاہد ہے کہ نوع انسانی کی تحصیل سعادت کی راہ میں ایک ذمہ دار صالح نظام کی شدید ضرورت ہر زمانے میں انسانی سوسائٹی کے سامنے ابھرتی رہی ہے اور قدم قدم پر ہمہ گیر مسائل حیات کی الجھنوں نے اس ضرورت کو ہمیشہ مانگ اور مطالبہ انسانی کے روپ میں پیش کیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو انقلاب فرانس اور دنیا کی دوسری اصلاحی شقیں معرض ظہور میں نہ آتیں، یہی انقلاب فرانس ہے جسے یورپ اٹھارہویں صدی کا کامیاب ترین اصلاحی شاہکار بنا کر پیش کرتا ہے لیکن دیانت دارانہ تجزیہ اس حقیقت کو دلیل بنا کر نمایاں کرتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ نے ارتقا واصلاح کی جو چھلانگیں لگائیں وہ انسانیت کی تکمیل کے رنگ وروغن سے بے بہرہ تھیں اور یورپ کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود کوئی صالح نظام عالمگیر طور پر رونما نہ ہوسکا، جس طرح بعض بیماریوں کے اثرات انسان کو چڑچڑا اور خبطی بنا دیتے ہیں بالکل اسی طرح صدیوں کی اخلاقی کمزوری بھی وارفتہ شعور واحساس کر دیتی ہے اور قوم کے اخلاقی شعور کو اس کی حد بلوغ پر روبراہ کرنے کے لئے ایک صالح نظام تربیت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے، عالم اسلام کی ہمہ گیر سرگزشت میں طوفان حوادث کی لہروں

کے انتشار انگیز اثرات کے سانچے پڑے ہیں اور گردش شام وسحر کے رنگین نقوش کے بننے اور بکھرنے کا ایک سلسلہ دراز ہے، محفل شب کی جان چاند تارے زندہ دلان منزل شوق کو معنی خیز انقلاب کا کتنا گیت سناتے رہے۔ صبح سیمیں کی زرتار کرنیں تشنگان باغ و بہاراں کے قدموں پر شبنم کے زرنگار موتی نچھاور کرتی رہیں لیکن قافلہ انسانی پھر بھی منزل فلاح وارتقا کی حقیقی روشنی سے ہم کنار نہ ہوا اور خلاؤں میں اسٹیشن بنانے والا انسان زمین پر ناموس انسانیت کی قدر و قیمت سے متعارف نہ ہوسکا، انسان کی گمراہی منزل اگر یہی کرتی کہ وہ اپنے خود ساختہ تصورات ومزعومات کو کلیجے سے لگائے اپنی راہ چلتا تو اتنا گلہ نہ تھا، ستم تو یہ ہے کہ شیطانی اور طاغوتی قوتوں نے اسلام اور اسلامی قدروں کی نشو ونما کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کیں، ان کا تسلسل ٹوٹتا نظر نہیں آتا، کفار مکہ کی ابتدائی مخالفتوں اور آج کی انتہائی نظریاتی اور عملی عداوتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ یہ ایک تسلسل کی مسلسل کڑیاں ہیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تاامروز
چراغ مصطفیؐ سے شرار بولہبی

فریق مخالف کا یہ محاذ جو مخصوص طور پر اسلامی آثار و روایات کے استیصال کی خاطر پورے زور وشور سے سرگرم عمل ہے تمام عالم اسلام کے لئے عمومی طور پر اور اسلامیان ہند کے لئے خصوصی طور پر نہ صرف تشویش انگیز ہے بلکہ ایک واضح فکر اور منصوبہ بند عمل کا متقاضی بھی، سرزمین ایشیا کا اسلامی حلقہ جونت نئے فتنوں اور میلان کش پالیسیوں کی آماجگاہ بن رہا ہے، یہ ہمہ گیر اسلام دشمن سازشیں مسلمانوں کی صرف جانی و مالی تباہ کاریوں ہی سے اپنی پیاس بجھانی نہیں چاہتی بلکہ ان کے پیش نظر تو خالص اسلامی زاویہ فکر ونظر کی بربادی ہے اور یہ افسوس ناک وگلہ ناک حقیقت ہے کہ ان شاطرانہ چالوں نے خود مسلمانوں میں ایک ایسا دیرپا دوررس اور مہلک مغالطہ تصور پیش کردیا ہے جس سے

اسلامی قدروں کی روبراہی میں چند در چند رکاوٹیں اور دقتیں نمایاں ہو رہی ہیں، اِسی سلسلے کی ایک نتیجہ خیز کڑی زوال خلافت کے اسباب و موثرات کا پس منظر ہے اور دوسری ہمت شکن حالتیں وہ ہیں جو جزائر عرب اور مصر و فلسطین کو ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ کرنے میں متحرک ثابت ہوئیں، دراصل یورپ کے شاطر سیاست دانوں نے ان خطرناک ہتھیاروں اور سیاسی کھلونوں کا استعمال صرف اس غرض سے کیا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آجائے کہ ترکی کا مرد مجاہد خود اپنی طاقتوں کو سمیٹنے پر مجبور ہو جائے اور مشرق وسطی استبدادیت کے پروان چڑھانے کی اعلیٰ ترین منڈی ثابت ہو سکے، ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی انہی تصورات کی رہین منت تھی اگر چہ نوعیت بدلی ہوئی تھی لیکن نتائج کے اعتبار سے یکسانیت تھی اور ان موثرات کے بعد سے اب تک محسوس اور غیر محسوس طور پر جو کچھ عالم اسلامی میں رونما ہوا اور ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں جس قدر ابتری اور انتشار کی کیفیتیں اثر انداز ہو رہی ہیں انہیں اگر ماسبق حالات کے سنگین نتائج سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اور اب، جب کہ ملک گیر طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے جان و مال کے درپئے ان کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کے لئے جو وحشت ناکی اور بہیمیت زور و شور سے ابھری ہوئی ہے اس سے صرف نظر کرنا اور اتفاقی حادثات سے تعبیر کرنا بجلیوں کی باڑھ میں بجلیوں کو جھٹلانا ہے۔ لیکن کیا کسی ایسی قوم کے حق میں جو بجلیوں کی باڑھ اور طوفانوں کی لہروں اور سیلابوں کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی ہو، صرف ان ناموافق حالات اور نامساعد اثرات کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب کوئی علاج ممکن نہیں؟ ماضی کے مسلمانوں کی حیات بابرکات اور ان کی خدمات جلیلہ کو ذہن میں رکھ کر اگر فیصلہ کیجئے تو بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں اس قسم کی بلکہ اس سے ہلکی بات بھی کہنا گناہ ہے۔ کیونکہ جان و مال کی بربادی، تجارت کا زوال، صنعت و

حرفت کی تباہ کاری، عزیز ترین تمناؤں کا گھٹ کر رہ جانا اعزہ کا موت کی آغوش میں چلے جانا، زندگی کے آرام وسکون کا یکسر رخصت ہو جانا، اور اپنی نظروں کے سامنے اپنے کلیجے کے ٹکڑوں اور شیر خوار بچوں کا ذبح کیا جانا، ایک مسلمان کے لئے یہ ساری مصیبتیں رو پیٹ کر اور کلیجے پر پتھر رکھ کر صبر کئے جانے کے قابل ہو سکتی ہیں لیکن وہ ناموس اسلام کی بربادی وتباہی کا جانکاہ منظر اپنی نظروں سے صرف تماشائی بن کر دیکھنے کا متحمل نہیں۔

چرخ نیلی فام سے پوچھو، گردش صبح و شام کی دھڑکنوں سے گواہی لے لو، سرگزشت انسانی کی شکست وریخت کے لمحات سے دریافت کر لو، مصائب کے طوفانوں سے کھیلنے والا مرد مجاہد سمندر کی موجوں پر دندناتا ہوا مرد مومن اور تلواروں کی چھاؤں میں اللہ اکبر کا غلغلہ بلند کرتا ہوا مسلمان مدائن کے ٹاپوؤں میں، جبل الطارق کی گھاٹیوں میں، قادسیہ اور یرموک کے میدانوں میں موت کے تھپیڑوں کو، طوفانوں کی بلاخیز لہروں کو، حوادث کے سیلابوں کو اور تلواروں کی جھنکاروں کو لبیک کہتا ہوا اور للکارتا ہوا جب دشمنان دین کی صفوں پر برق خاطف بن کر اپنی کوند سے کائی کی طرح پھیلے دشمنوں کے دل بادل لشکر کو پھاڑ دیتا ہے تو رحمت کی گھٹائیں جھوم جھوم کر اس پر برسنے لگتی ہیں اور کامرانی اس کے قدموں پر شوق سے نچھاور ہوتی ہے۔

مرتے سبھی ہیں، ایک گوشہ گمنامی میں عزلت وذلت کی موت مرتا ہے اور زمانہ اسے حرف غلط کی طرح بھول جاتا ہے، دوسرا مرد میدان بن کر دلیرانہ اقدامات کرتا ہوا اور قومی دفاع کا کمال دکھاتا ہوا جام شہادت نوش کرتا ہے۔ تو اس کے قطرات خون پر رحمت کا فرشتہ حیات جاوداں کے پھول برساتا ہے۔

هرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

حمزہ شجیع کی والہانہ قربانی، فاروق اعظم کی درس آموز شہادت، علی مرتضٰی کی

بامعنی شہادت، اور سید الشہداء کا ذبح عظیم خالص اسلامی زندگی کے وہ عنوانات ہیں جن سے جتنا استفادہ واستفاضہ کیا جائے ناکافی ہے اور زندگی جاوید سے مالا مال ہونے والی یہ وہ روشن وتابناک مثالیں ہیں جن پر ملت اسلامیہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

اسلام کی تاریخ میں فروغ اعلائے کلمۃ الحق اور ناموس دین وملت کے تحفظ کی خاطر جو مسلمان بھی مصائب وآفات کا شکار بنتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کا کارنامہ جلیل انجام دیتا ہے وہ نہ خود زندہ جاوید ہو جاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی حق پرستانہ زندگی کی پاکیزگی کی عملی تعلیم دے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کی شدائد ومحن سے بھرپور زندگی کا ہر لمحہ تابناک عبادت بن کر درخشاں اور برکت فشاں بن جاتا ہے اور اسلام کی اصطلاح میں اس کی ہر حرکت وعمل کے بدلہ میں دس نیکیاں ودیعت کی جاتی ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها (جو ایک نیکی کے ساتھ آئے گا اس کے لئے ہمارے پاس اس جیسی دس نیکیاں ہیں)

مصیبتوں بھرے حالات اور تلخیوں سے لبریز لمحات دوسروں کے لئے گھبراہٹ اور بے چینیوں کا موجب ہوں تو ہوں لیکن مسلمان کے لئے تو اس کی ہر نیکی کے عوض دس نیکیاں مقدر ہیں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے کہ مسلمانو! سراسیمگی اور پریشانی کیا ہے، میدان کسی حال میں فائدوں سے خالی نہیں، دفاع میں کمزوری پیدا نہ کرو، حالات کی مناسب نگرانی، زندگی کی بناوٹ میں ہم آہنگی وتوازن اور اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی قدروں کا احیا وتحفظ اور ان سے صالح نظام زندگی کا بندوبست اور مسلمانوں کی ملی واجتماعی زندگی کی سازگارانہ ترکیب وتشکیل کے یہی اجزائے ترکیبی، جن کا خمیر اسلامی خوداعتمادی کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے تمام ترکلیدی زاویے ہیں:

بقول حکیم مشرق علامہ اقبال

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

دفاع:

دفاعی طاقتوں کی مضبوطی جو کسی قوم کے لئے لازمہ حیات کا درجہ رکھتی ہے، بغیر اس کے کہ کسی انسانی جان کی قدر و قیمت کو نظر انداز کیا جائے، بے حد ضروری ہے۔ اسلام ظلم و فساد کو ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتا کیوں کہ انسانی معاشرے کی برومندی ظلم و فساد کے ہوتے ہوئے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی اور اسی لئے وہ فرماتا ہے:

من قتل الناس فکانما قتل الناس جمیعا و من احیاھافکانما احیا الناس جمیعا۔

(مطلب: جس نے کسی ایک انسان کو بے قصور قتل کر ڈالا تو گویا اس نے پورے معاشرہ انسانی کا گلا گھونٹ دیا اور جس نے کسی ایک بے قصور انسان کی جان بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو حیات نو بخش دیا)

دعوت فکر و نظر کا یہ مقام انسانی شعور و بینش کے لئے کس قدر سبق آموز اور عبرت آگیں ہے، اسلام کی ہمہ گیر تکمیل انسانیت کی عالم افروز قدروں کی روشنی میں انسانی جان و مال کا تحفظ اور احترام انسانیت کا مرتبہ اتنا واضح اور روشن ہے کہ اسلام کے طرز عمل کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔

حوصلہ:

دفاع کے ساتھ ہی ساتھ دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ خوف و دہشت کو اپنی زندگیوں سے نکال پھینکا جائے کیونکہ قومی شعور کی نشو و نما کے لئے خوف اور دہشت ایک

بدترین قسم کی لعنت ہے، یہ لعنت جب شدت اثر کے رنگ میں کسی قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر غالب آجاتی ہے تو اس قوم کا شاندار روایاتی اور اخلاقی کردار اپنا مفید ترتیبی تسلسل کھو بیٹھتا ہے اور تعلیم، تجارت، معیشت، معاشرت، اخلاق، صنعت وحرفت کسی شعبہ میں بھی حوصلوں اور جاندار ولولوں کی ہم آہنگی باقی نہیں رہتی، سچ یہ ہے کہ خوف ودہشت تو عدم توازن کی ایک بدترین صورت ہے، جب قوم کا مزاجی توازن باقی نہیں رہتا تو اس کا سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے، اور پھر وقت کی بے وقت ہوائی لہریں بھی سکون واطمینان کی زندگی کو تہس نہس کر دینے کے لئے کافی سمجھی جانے لگتی ہیں۔

افواہ سے بچنا:

خوف ودہشت ہی کی طرح افواہوں پر یقین کر لینا اور کسی بات کی تصدیق کئے بغیر صرف اپنے ظن وگمان کو صحیح سمجھ لینا بھی قومی زندگی کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ:

ومنهم اميون لايعلمون الكتب الا امانى وان هم الايظنون.

(اور بعض ان میں کے ایسے جاہل ہیں کہ کتاب الٰہی (اور اس کے طریقہ کار) سے تو واقف ہیں نہیں بس اپنے جھوٹے اور جاہلانہ خیالات میں گم ہیں اور صرف ظن و گمان سے کام لیتے رہتے ہیں)

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کتاب اللہ کے احکام، اس کی ہدایتوں، اس کے اوامر ونواہی، اس کے رموز وتماثیل اور اس کے طریقہ کار سے پوری طرح واقف نہیں ہے تو اسے خموش رہنا چاہئے اور اپنے محدود دماغ کو خواہ مخواہ ہوائی اور خیالی گھوڑا دوڑانے میں مشغول نہیں کرنا چاہئے، مگر اس آیت سے ایک قاعدہ کلیہ یہ سامنے آتا ہے کہ صرف ظن وگمان اور غیر مصدق بات کو مان لینا قرآنی طریقہ کار

کے خلاف ہے۔

بدقسمتی سے ہماری معاشرتی زندگی میں یہ زہر پوری طرح پھیل چکا ہے، ہم بہت سارے مسائل کے سلسلے میں اور بحرانی لمحات میں اپنے ظن و گمان پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی غیر مصدقہ اطلاعات پر یقین کر لیتے ہیں اور نتیجتاً غیر قرآنی طریقہ اختیار کرنے کے سبب نقصان اٹھانے والوں میں بنتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ دفاعی طاقتوں کی کمزوری، خوف و دہشت کی زیادتی اور افواہوں پر یقین کرنے کا مرض آخر کیوں پیدا ہوا؟ کون سی ایسی گمشدہ کڑی ہے جو ہماری ملی زندگی کا شیرازہ بکھر جانے کا سبب بن گئی ہے؟

دینی اقدار کی بحالی:

میرے خیال میں "دینی اقدار" ہی دراصل وہ گمشدہ کڑی ہیں جن کے کھو جانے کی وجہ سے موجودہ مسائل پیدا ہو رہے ہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ معاشرے میں دینی اور اسلامی اقدار کا صحیح تعارف کرایا جائے اور اس سلسلے میں وقت کے رحم و کرم پر بھروسہ نہ کیا جائے کیونکہ کسی لادینی نظام میں دینی قدروں کی نشو ونما کے لئے وقت کے رحم و کرم پر بھروسہ کرنا بصیرت کے منافی ہے، خالص اسلامی زندگی کی تحصیل و تشکیل مسلمانوں کے لئے عظیم تر دینی فریضہ ہے۔

اور میرے خیال میں ایک اوسط درجے کی عقل و بینش کا حامل مسلمان بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ دراصل صحیح اسلامی زندگی ہی نوع انسانی کی اکمل ترین زندگی کا روشن تصور ہے اس لئے اس کے حصول میں قصور ہو سکتا ہے اور اس کی تہذیب و تنظیم میں مسلمان غلطیاں کر سکتے ہیں لیکن کوئی مسلمان اس کی عظمت و برکت کا انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ہم دیانت دارانہ طور پر خالص اسلامی زندگی ہی کو تمام مصیبتوں کا واحد حل یقین

کرتے ہیں، انسانیت کی بقاو حفاظت اور نوع انسانی کی مفید ترین خدمت اسی زاویہ فکرو نظر کے تحت انجام پاسکتی ہے۔

مگر وقت کی ناساعد لہروں نے ایک خطرناک کھیل یہ کھیلا کہ عام مسلمان کے ذہنی سانچے کو منتشر کردیا اور اس طرح خالص اسلامی زندگی کے بہترین طرز زندگی ہونے کا اساسی تصور ہی عام مسلمان کے ذہن سے نکل گیا، مخالف طاقتیں دراصل یہ مان کر اپنا کام شروع کرتی ہیں کہ کسی حساس قوم کے اساسی تصور کو اگر متزلزل کردیا جائے تو زوال کے باقی مرحلے وہ قوم خود بخود طے کرلیتی ہے، اساسی تصور کو بے جان بنانے کے لئے قوت اور دولت کا کوئی حربہ اثر انداز ہونے کی طاقت نہیں رکھتا جب تک کوئی قوم اپنے تابناک ماضی وحال سے دستبردار ہونے کے لئے خود ہی تیار نہ ہو جائے، قومی تشخص اور ملی رجحانات کے اصلی اضمحلال کا سرچشمہ دراصل قوم کی خودشناسی اور خود فراموشی کے سوتوں سے پھوٹتا ہے اور پھر سارے روایاتی خط وخال کو غرقاب کرکے دم لیتا ہے، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ بے شعوری میں ہم اپنے ملک اور اپنے گھر میں خودناشناسی اور فریب خوردگی کا جرعہ ابلہانہِ نوش جاں کر بیٹھے ہیں، اس میٹھے زہر کا گھونٹ کیف آور بھی تھا اور ہوش ربا بھی۔

قومیں جب اپنی پہچان کھو بیٹھتی ہیں تو پھر ویسی ہی خطرناک صورت حال پیدا ہوتی ہے جیسی خطرناک صورت حال سے ہم ہندوستان میں گذر رہے ہیں، ہماری خود ناشناسی اور فریب خوردگی نے حریفوں کو ہمارے خلاف ہر ممکنہ شورش کے برپا کرنے کے مواقع پیدا کردیئے ہیں اور موجودہ شورشوں نے پھر ملت اسلامیہ کو اس موڑ پر لاکر کھڑا کردیا ہے جو ایک طرف اگر سنگین عواقب ونتائج کا دروازہ کھول رہا ہے تو دوسری جانب گذشتہ نبویؐ اور الٰہی طریق کار کی اہمیت بھی واضح کررہا ہے۔

گہری نیند کے متوالوں کو کاروانِ وقت کی رستخیز پھر جھنجھوڑ رہی ہے کہ اگر جلد

ہی کمر کس نہ لی گئی تو ڈر ہے کہ فلک کج رفتار میٹھی لوریاں دے کر اور خواب آور گھونٹ پلا کر پہلے سے زیادہ گہری نیند نہ سلا دے، اور اگر ہم نے اب بھی جاگنے کی زحمت گوارہ نہ کی تو ممکن ہے کہ ع

ہماری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ غلط اور گمراہ کن بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ جان و مال کے تحفظ کی فکر، عشرت شبانہ کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونے کا وسوسہ، پرسکون زندگی کا پرفریب تصور، محلوں کی آراستگی اجڑ جانے کا غم، اور تجارت و معیشت کی ترقی و بہبود کا احساس مذہب و اخلاق اور اسلام کے اس اساسی تصور کی چمک کو ماند کردے جو اس امت کے لئے زیادہ گراں قدر اور کائنات وجود سے زیادہ عظیم تر ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تشخص کی ہر شق اور امن وطمانیت کی ہر جدوجہد کا منشا اول وآخر اسلامی قدروں کا روبراہ ہونا ہے اور اسی پر انسان کے شریفانہ خصائص کے استحکام وتحفظ کا انحصار ہے، ان شریفانہ خصائص کی بنیادی شق اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، یہ ہے تو سب کچھ ہے اور یہ نہیں تو کچھ نہیں، امام بخاری نے یہ حدیث روایات فرمائی ہے کہ

لاطاعته لمخلوق فی معصیة الخالق

یعنی جیسے ہی اللہ تعالٰی کی نافرمانی وسرکشی کا سوال پیدا ہوتا ہے ویسے ہی مادی تعلقات کی تمام شقیں گر جاتی ہیں اسلام کی چھاؤں میں سفر کرنے والے مسافر کے لئے سعید ترین منزل تو عزیمت ہی کی ہے رخصت کو بہرحال ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

وکاین من نبی قاتل معه ربیون کثیرا. فما وهنوا لمااصابهم فی سبیل الله وما ضعفو و ما استکانو والله یحب الصابرین.

(مفہوم: اور دیکھو کتنے نبیؑ ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے باخدا لوگوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سختیوں اور مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں خدا کی راہ میں پیش آئیں وہ بے ہمت ہو گئے ہوں اور نہ ایسا ہوا کہ وہ کمزور پڑ گئے یا ان کی عزت نفس اور غیرت ملی نے یہ بات گوارہ کر لی ہو کہ ظالموں کے سامنے عجز اور بے چارگی کا اظہار کیا ہو، بے ہمتی و کمزوری اور عجز و بے چارگی ایسی باتیں ہیں جن کو باخدا دین دار اور خود دار مسلمان گوارہ نہیں کر سکتا اور اللہ انہیں لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو

گویا قرآن کی روشنی میں باخدا اور سچا مسلمان وہی ہے جو شدائد و محن میں ہمت نہ ہارے اور حالات کا دلجمعی اور ہوش مندی سے مقابلہ کرے اور اپنے دفاع و تحفظ کی راہ میں کسی کمزوری کو آڑے نہ آنے دے اور سختیوں سے گھبرا کر ظالموں کے آگے عجز و بے چارگی کا اظہار نہ کرے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اکثر بستر استراحت پر آرام فرمانے کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری ہوتے تھے:

"اللھم انی اعوذبک من الجبن و اعوذبک من الکحل"

(اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے بزدلی و بے ہمتی کے وسوسوں سے اور اور ابھرنے نکھرنے اور سنورنے کا ولولہ انتشار واضطراب کے ہاتھوں ہی پیدا ہوتا ہے۔

[illegible]

اور ابھرنے نکھرنے اور سنورنے کا ولولہ انتشار واضطراب کے ہاتھوں ہی پیدا ہوتا ہے۔

حساس قوموں کی زندگی میں ذلت و زوال کا مرض ایک ہی بار آتا ہے لیکن جب کوئی فرد یا جماعت اس مرض کو معمولات زندگی میں شامل کر لیتی ہے تو یہی مرض قومی اور ملی موت

ہے:
کا شاخسانہ بن جاتا ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے:
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفس محمد بیدہ لتامرون
بالمعروف و تنھون عن المنکر اولیو شکن اللہ ان یبعث علیکم عقابا من
عندہ ثم لتدعو نہ فلا یستجاب لکم۔
(فرمایا نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے کہ اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضے
میں محمد کی جان ہے، تم لوگ اچھی باتوں پر عمل کرنے کے لئے اور بری باتوں سے بچنے
فطرتِ انسانی نے اپنے اولین مرحلہ اٹھیں گی کھتے اکابرو گے مگر تمہاری پکار اور
ارتقا طے کیے ہوں اور پرواز فکر و نظر کے جتنے مرکزی دائرے بھی بنائے ہوں اس
حالت پر قناعت نہیں کی اور نہ ہی اس تلاش منزل میں کہ، نگار رنگ نقش و نگار کے گرد گھومتا
نظر کے دھوکوں نے برخود غلط کتنے ہی اصنام تصور تراشے اور ڈھالے ہوں اور بقدر ذوق
بلوغ حسین سے حسین تر رنگ و روغن ان کی دلکشی و دل آویزی میں صرف کر ڈالا ہو لیکن
شام کا مسافر صبح منزل کی زرتار کرنوں سے زندگی کا دھندلکا دور نہ کر سکا، بصیرت کا یہ دل
فریب شاہکار ہمیشہ بصارت کی چکا چوندھ میں کھویا رہا، قرآن کریم نے انہی تمثالی
حالتوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:
ہے پھر ہم نے اسے لوٹا دیا پستی کی حالت والوں سے نی زیادہ ی لی فلا رسافلہ:

آیت کریمہ پر طویل گفتگو سے قطع نظر ایک بات خاص طور پر توجہ کے لائق ہے کہ دراصل انسان کی ترکیب میں تمام تر خصائص کائنات جمع کر دیئے گئے ہیں اور انسان اپنی فطری بلندیوں میں عظیم تر ملکات عالیہ کا عجیب وغریب مرکب ہے اور انہی سربستہ راز طاقتوں اور ملکات عالیہ کے روبراہ کرنے کے لئے اسلام اور قرآن نے ایمان اور عمل صالح کے اجزائے ترکیبی کو شامل کیا ہے کہ ان کے بغیر خصائص انسانی کی گراں بہا قدروں میں توازن نہیں پیدا کیا جا سکتا اور کوئی انسان انسان کامل کے روپ میں نمایاں نہیں ہو سکتا، انسانی فکر وعمل کا کوئی گوشہ اور اختیار وقبول کا کوئی زاویہ اور صحت و درستگی کی کوئی راہ ایسی نہیں جو خطرات اور ہلاکتوں سے یکسر پاک ہو۔ لیکن جہاں شرف انسانی کی معراج ہی معراج ہے اور زوال کا کوئی نشان نہیں، وہ خالص اسلامی طرز زندگی ہے۔

قرآن کریم نے تکمیل انسانیت کی اسی اصل عظیم اور مراتب ارتقائے انسانی کے انہیں تابناک نقطوں اور زاویوں کو ''احسن تقویم'' سے تعبیر کیا ہے۔ اصطلاحات قرانیہ کا یہی ہدایت آثار گوشہ ''قلب سلیم''، ''بصیرت ایمانی''، ''بصیرت نبویؐ''، ''عمل صالح''، ''اسوہ حسنہ'' اور ''معراج ایمانی'' کے مختلف بابرکات اشاروں سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

لہٰذا قرآنی نقطہ نظر سے موجودہ تمام تر جماعتی اضمحلال، قومی تباہ کاری و بربادی اور عام انسانی جان و مال کے اتلاف وضیاع کے حقیقی اسباب یہی ہیں کہ مسلمانوں نے صدیوں سے خالص اسلامی زندگی کو خیر باد کہہ دیا اور خارج از فکر وعمل قرار دے دیا، اور ایسا اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ مسلمان ایک عالمگیر سرمایہ انسانیت کی مثال ہیں، خیر امت ہیں اور خدا کا فیصلہ اور اعلان ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اور وقت کی کوئی سازش مسلمان کو برباد و منتشر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ولاتھنوولا تحزنووانتم الاعلمون ان کنتم مومنون۔

(ہراساں اور پریشان مت ہو، کامیابی تمہارے لئے ہے اگر تم صاحب ایمان ہو)

اس آیت میں ایمان اور کامیابی کو ایک دوسرے کا مترادف قرار دیا گیا ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم صاحب ایمان ہونے کے دعویٰ دار بھی ہیں اور پھر حیران و پریشان اور ذلیل وخوار بھی۔

ایسا کیوں؟

میرے خیال میں ایسا صرف اس لئے ہوا کہ ہم نے صاحب ایمان کے لئے کامیابی کا اعلان تو یاد رکھا مگر خدا کا دوسرا فرمان بھول گئے کہ:

یا یھاالذین آمنو ادخلو فی السلم کافه

(اے وہ لوگو جو صاحب ایمان ہوئے ہو، اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ)

معلوم ہوا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھ لینا ایک الگ بات ہے اور اسلام میں پورے طور پر داخل ہونا بالکل ہی دوسری بات، قرآن کا وعدہ صرف کلمہ پڑھ لینے والوں سے نہیں ہے کیونکہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ایک پیغمبر بھیجنا اور اس سلسلہ ذریت کو عزت دینا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول کی مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میرا عہد میرا کوئی وعدہ، ظالموں کے ساتھ اور ظالموں کے لئے نہیں ہے۔

اور اس پس منظر میں قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا جو بہترین اور حسین ترین طریقہ کار ہے وہ اسلام کا طریق کار ہے، اور سماجی نقطہ نظر سے ایک بہترین انسان کی جو تعریف ہو سکتی ہے قرآن کریم کی اصطلاح میں مومن بھی وہی ہے جس کا بہترین نمونہ رسول اکرمؐ کی حیات مبارکہ میں

ہمیں ملتا ہے اور جن کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ کے رسول کی ذات گرامی میں بہترین اخلاق کا نمونہ موجود ہے۔

پس اس اخلاق کے معیار پر جو پورا اترتا ہے وہی مومن ہے۔

وہی اسلام میں پورے کا پورا داخل ہے۔

اور کامیابی کی بشارت اسی پیرو محمدؐ کے لئے ہے۔

مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے اپنے مفروضات کو اسلام سمجھ لیا ہے نتیجتاً طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں، اور اپنی غلطیوں کے سبب پیدا شدہ صورت حال ارباب دانش و بینش کے ناخن تدبیر سے بار بار اپیل کر رہی ہے کہ وہ وقت کے نمائشی اور رسمی زاویہ فکر و نظر کو پامال کر کے خالص اسلامی زندگی کے احیاء کا سروسامان کریں ورنہ مسلمانوں کی ذہنی ابتری اور انتشار و پریشانی نے اگر ہلاکت و بربادی کی ہولناک صورت اختیار کی تو اس کی ساری ذمہ داری انہی لوگوں پر ہوگی۔

كما قال النبی صلی الله عليه وسلم عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم مثل المداهن فی حدود الله و الواقع فيها مثل قوم استهموا سفينته قصار بعضهم فی اسفلها وصار بعضهم فی اعلاها فكان الذی فی اسفلها يتمروبالماء علی الذين فی اعلاها فتاذوبه فاخذناساً فجعل ينقه فی اسفل السفينته فاتواه فقالو امالک قال تاذيتم بی ولا بدلی من الحياء فان اخذ و اعلیٰ يديه انجوه و نجوانفسهم و ان تركوه اهلكوه واهلكوانفسهم.

یعنی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے احکام وقوانین کے ابلاغ و اظہار میں مداہنت اور تساہلی کرنے والوں کی مثال اور ان لوگوں کی مثال جو احکام خداوندی کی تعمیل میں غلطی و غفلت کا

ارتکاب کرتے ہیں اس قوم کی سی ہے جس کی دو پارٹیاں کسی جہاز کے مختلف حصوں کو آپس میں تقسیم کرلیں کچھ لوگ نچلا حصہ لے لیں اور کچھ لوگ بالائی حصہ اپنے زیرِ تصرف رکھ لیں، پھر اس دریائی سفر میں نچلے درجوں والے ضرورتاً پانی لینے کے لئے اوپر آئیں لیکن اوپر والے افراد نیچے والے ضرورت مندوں کی آمد کو مداخلت بے جا سمجھیں اور ان کی وجہ سے زحمتیں محسوس کریں۔ نتیجتاً ازراہ بددلی و جذبہ انتقام نیچے والے اس مشترکہ جہاز کے حصوں میں سوراخ کرنے لگیں اس خطرناک صورت حال سے گھبرا کر اور خائف ہوکر اوپر والے بلندی سے اتر کر زیریں حصہ جہاز میں آئیں اور نیچے والوں سے پوچھیں کہ بھائی یہ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو اتنی ہلاکت خیز حرکت کا انتخاب کر رہے ہو، تمہاری یہ ناعاقبت اندیشانہ حرکت تو ہمیں اور تمہیں دونوں کو لے ڈوبے گی اور جہاز کے نچلے حصوں میں سفر کرنے والے جواب دیں کہ جب تم نے ہمیں اپنے مہلک طرزِ عمل سے اذیت و تکلیف میں مبتلا کر دیا اور ہمارے مفادات سے چشم پوشی اختیار کرلی اور ہماری ہلاکت کا سبب بننے لگے تو پھر ہم لوگوں کے لئے دوسری کون سی صورت باقی رہ گئی تھی۔

افسوس! اگر اس سفینے کی طرح ہندوستان میں موجود سفینہ امت کے بالائی حصہ والے اپنے زیریں حصہ والے بھائیوں کی بقا و تحفظ کی خاطر صحیح رہنمائی نہیں کریں گے اور مفادات ملت اسلامیہ کی راہ میں ملت کی دستگیری اور رہنمائی نہیں کریں گے تو نہ خود بچ سکیں گے اور نہ ہی زیریں حصے میں بسنے والے اپنے بھائیوں کو تباہی و بربادی اور آفت و مصیبت سے نجات دلا سکیں گے۔

حسرت بالائے حسرت! لوگ اپنی خودغرضانہ مفاد پرستی اور غفلت کے مہلک نتائج کا شکار خود بھی بن رہے ہیں اور غریبوں کو بھی بنا رہے ہیں ورنہ حدیث مقدسہ کا تمام تر سیاق و سباق جن تمثیلی قدروں کو اجاگر اور آشکار کر رہا ہے وہ دراصل وہی دینی اور ایمانی قدریں ہیں جن کے تحفظ کے سبب ملت اسلامیہ کا سفینہ بھی طوفان ہوائے مخالف

کی تباہی و بربادی سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اس سفینے میں روشن مقدس شمع اسلامی معاشرہ کی خالص ایمان و انسان دوست تہذیب کی تشکیل و تکمیل میں شمع راہ کے مماثل ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کیا اور صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور علماء و صلحا و اولیائے امت نے اپنا خون جگر دے کر روشن ہی نہیں رکھا بلکہ باد مخالف کی تیرہ بخت سازشوں کو ناکام بھی بنایا۔

لہٰذا آج، اس دور میں بھی اسلامی زندگی کے مکمل طور پر روبراہ لانے اور اس کے احیاء کا از سر نو بندوبست کرنے میں علماء صلحاء اور مشائخ کرام کا پرخلوص جہاد اور جدوجہد از بس ضروری ہے، حالات کے خطرناک تقاضوں کو اگر اتفاقی حادثہ سمجھ لیا گیا اور خالص اسلامی حقائق و ہدایات کی روشنی میں مسلمانوں کی بروقت رہنمائی نہ کی گئی تو نہیں کہا جا سکتا کہ معاشرتی، تہذیبی، مذہبی اور تمدنی معاملات و رجحانات کس سمت کو اپنا رخ موڑ لیں گے اور اس غفلت و تساہلی سے کیا سنگین نتائج پیدا ہوں گے!

موجودہ حالات میں مناسب توازن اور ذہنی ہم آہنگی پیدا کئے بغیر الیکشن بازی یا سیاسی ہلڑبازی مسلمانوں کے لئے نہ پچھلے دنوں میں کوئی اصلاحی قدم ثابت ہو سکی تھی اور نہ اب اس سے کوئی اصلاح پذیر نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرز اصلاح اور طریقہ تبلیغ سے استفادہ کیا جائے، ٹھوس اور موثر طریقوں سے مسلمانوں میں اسلامی طرز فکر کو اجاگر کرنے کی صورتوں پر عمل پیرا ہو کر مخلصانہ جدوجہد کا احیاء کیا جائے اور یہ کام خواہ سر سے کفن باندھ کر ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن اس سے جی چرانا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک گناہ عظیم اور جرم عظیم کے مترادف ہوگا۔

زاویہ فکر و نظر میں خالص اسلامی بلند حوصلگی کا احیاء، اور اس کا سراغ، قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کا مصلحانہ اور مخلصانہ تتبع، اور خلفائے راشدین و

ائمہ اہل بیت کی دینی عزیمت اور پامردی کی بے مثال للّٰہیت وحق پرستی اب بھی مسلمانوں کی ساری ذہنی بدنی، داخلی خارجی دینی اور دنیوی پریشانیوں اور اخلاقی و معاشرتی تباہ کاریوں کو دور کر کے مسلمانوں کو قومی ترقی، خوش حالی اور اسلامی حد پرواز کی باعزت بامعنی اور باخدا معراج سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وماتوفیقی الاباللہ علیہ توکلت والله اینب۔!!

بنیادی مسئلہ

بنیادی مسئلہ:

گذشتہ صفحات میں بطور تمہید یہ بیان کیا گیا کہ ۱۸۵۷ء سے آج تک مسلمانوں کے ادبار و زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے فرمان یا ایھا الذین آمنوادخلوفی السلم کافہ کے مصداق نہیں بن سکے۔

اس سلسلے میں پس منظر کے طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے کچھ سبق آموز اور بابرکت گوشے اجاگر کئے گئے اور اس حوالے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ انتہائی مصائب وشدائد کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الوہی شمع روشن رکھی اور اس جہد مسلسل نے فتح مکہ کے اس حسین ترین لمحے کو بارگاہ نبوت کے قریب ہونے کا موقع عنایت کیا جب رحمتہ اللعالمین پر رب العالمین کی بے پایاں محبتوں شفقتوں اور عنایتوں کی بارش ہونے لگی اور عرش معلیٰ سے خوشیوں اور محبتوں میں ڈوبی آواز اٹھی اور سارے عالم پر چھا گئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

اوراتمام نعمت کے اس ربانی اعلان کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ کامیابی تو مسلمان کا مقدر ہے اور مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں

جگہ کامیاب ہو مگر اس دعویٰ کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی اٹھایا گیا کہ اس کے باوجود ملت پر ادبار کی گھٹائیں کیوں چھا رہی ہیں اور راقم کو قرآن پاک کی جانب سے اس کا جواب یہ ملا کہ ایسا اس لئے ہو رہا ہے کہ مسلمان اب وہ مسلمان ہی نہیں رہا جو قرآن کی نظر میں یا ایھا الذین آمنو کے معیار پر پورا اترے۔

اور راقم الحروف کے خیال میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ قرون اولیٰ کے بعد مسلمانوں سے جس اسلام کا آج تعارف کرایا گیا وہ کچھ ہو تو ہو لیکن قرآنی اور نبویؐ ایمان واسلام نہیں ہے کیونکہ اگر آج کے مسلمان کے پاس قرآنی اور نبویؐ ایمان واسلام ہوتا تو سلف کی طرح باران رحمت وعنایت اور کلید کشاد و کامیابی ہمارا بھی مقدر ہوتی۔

لہٰذا آئندہ صفحات میں راقم الحروف کی یہ کوشش ہوگی کہ اسلام اور قرآن کی جو اساسی اور بنیادی قدریں ہیں اور ان قدروں کی روشنی میں اسلام کا جو غیر آمیزش شدہ اور خالص تصور و پیکر ابھرتا ہے اسے عامتہ المسلمین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں پہلی منزل یہ ہے کہ ہم اسلام کو من حیث کل (مجموعی طور پر) سمجھیں اور اس کے بعد اس کے تمام بنیادی اجزاء اور اصول وضوابط کے افہام کی منزل آئے گی۔

اسلام اور اس کے بنیادی مقتضیات:

یہ بات کہ اسلام دراصل کن مقتضیات کو لے کر نوع انسانی کی فوز وفلاح کا مدعی بنا، دعوت فکر ونظر کا ایک اہم مقام ہے حالانکہ اسلامی تاریخ بجائے خود اس کا جواب ہے اور اس سلسلے میں زیادہ تعمق درکار نہیں کیونکہ اسلام کی اساس و بنیاد جن حقائق پر مبنی ہے، ان کے متعلق خود قرآن کریم ارشاد فرما چکا ہے کہ:

ذلک الکتاب لاریب فیہ، ھدی للمتقین الذین یومنون ویقیمون

الصلوٰة وممّا رزقنهم ينفقون. والذين يومنون بما انزل اليک وما انزل
من قبلک و بالآخرة هم يوقنون.

(اس کتاب قرآن مجید میں کوئی شک نہیں ہے، یہ کتاب کتاب
ہدایت ہے ایسے متقیوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز پڑھتے
ہیں، جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب
(قرآن مجید) آپ پر اتاری گئی ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ
آپ سے پہلے اتارا جاچکا اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ
آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں)

اس ربانی اعلان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام تمام مذاہب کا تتمہ و تکملہ ہے (اور اسی لئے وہ مسلمان ہونے کی دیگر شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی بیان کرتا ہے کہ قرآن مجید سے پہلے بھی جو کتابیں اللہ نے مختلف قوموں پر مختلف پیغمبروں کے ذریعہ بھیجیں ان سب پر ایمان لایا جائے) اور اس نے نوع انسانی کی تمام تر فوز وفلاح اور تحصیل انسانیت کبریٰ اور مدنیت صحیحہ اور تہذیب اخلاق وشائستگی کے لئے جو ضابطہ حیات مرتب کیا ہے ان سب کا مرکز ومنتہا ایک منزہ عن الادراک قوت حاکمہ و متصرفہ ہے جسے ذات الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ذات الٰہی کے عرفان وادراک کے مراحل میں انسانی فکر کی بے بسی و بے چارگی سورج کی طرح روشن حقیقت ہے کیونکہ انسانی ذہن وفکر انہی اشیاء وصور کا صحیح تصور حاصل کرسکتا ہے جو کسی واسطے سے ذہن ونظر سے روشناس ہوچکی ہوں۔

آثار قدیمہ کے کسی ایسے خطہ کے متعلق جن کے حالات وکوائف کتابوں میں تو پائے جاتے ہیں لیکن ان کا عینی مشاہدہ حاصل نہیں ہوا، تاویل وتعبیر کی جتنی لطیف راہیں پیدا کی جاسکیں، سب ممکن ہے مگر اس کا صحیح تصور جو اس کی سالمیت صحیحہ اور شہادت اصلیہ

پر مشتمل ہو کسی طرح ممکن الوقوع نہیں کیونکہ کسی ان دیکھی چیز کا ذہنی طور پر کوئی تصور کامل تصور قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بالکل اسی طرح دنیا کی مختلف اقوام نے اپنے اپنے تصورات کے مطابق تصور الوہیت کا جو آمیزہ تیار کیا ہے وہ پوری طرح ظنی اور قیاسی ہے، انسان نے اس کی مختلف صفات کمالیہ کے مختلف مظاہر کو حقیقت ذات سمجھ کر طرح طرح کی غلط راہیں پیدا کرلی ہیں جوان کے معتقدات کے مطابق چاہے جس قدر بابرکت اور قرین حقیقت ہو لیکن حقیقی طور پر ذات الٰہی کے کسی تصور پر اس کو منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

مناظر فطرت اور کائنات ارضی وسماوی تو دراصل امر الٰہی یا حکم خداوندی کی کارسازی وقدرت کے براہین و دلائل ہیں اور کارساز ازل کی لامتناہی بخشش وعطا کا ایک کرشمہ ہیں جن کو صرف اس کی خالقیت وربوبیت کا کمال یا اس کی قوت لازوال کی کرشمہ سازی کہا جاسکتا ہے کیونکہ خلقی طور پر ان میں تغیر وتبدل کا قانون فطرت کارفرما ہے۔

مگر خدا کا تصور تجسیم وتحدید سے بلند وبرتر ہے اور اسی لئے وحی الٰہی نے **لیس کمثله شیٴ** (کوئی شئے اس کی طرح نہیں ہے) کہہ کر مفاسد ومہالک کی تمام پیدا ہونے والی راہوں کا استیصال کردیا دوسری جگہ ارشاد فرمایا جاتا ہے:

لاتدرکه الابصار. وهو یدرک الابصار.

بصیرت ومشاہدہ کی قوت اس بے مثال ولازوال ذات کا ادراک کر ہی نہیں سکتی کیونکہ تصورات کے لئے امثال ونظائر ضروری ہیں، لہٰذا ایسی صورت حال میں خدا کا جو تصور بھی ہوگا وہ دراصل کسی نہ کسی مخلوق کا تصور ہوگا جو حد ومثال کے خد وخال میں ملبوس ہوگا اور اسے کسی طرح بھی اس لازوال ولانہایت ذات کا تصور نہیں کہا سکتا۔

مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک بین حقیقت ہے کہ انسان اپنی فکر میں اس

اعتقادی رویئے کا ابتدائے آفرینش سے ایک بہت نمایاں مظہر رہا ہے، چنانچہ تاریخ اقوام اور تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر قوم کے قومی مشاعر و احساسات تمام تر اسی شعور پر مرتکز ہوتے رہے ہیں جو اس کی مذہبی اور اعتقادی فکر ہے۔

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس راہ میں اصح و اصلح فکر کیا ہے۔ کیونکہ مذاہب عالم کی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ان تمام تصورات اور دینی اعتقادات کی بنیاد وہ نہ رہی جو ہونی چاہئے تھی بلکہ اس تخیل و تصور میں مختلف النوع رنگ و روغن کی آمیزش نے اصل حقیقت کو مشکوک و مشتبہ کر دیا اور اس بے راہ روی نے صحیح راہ کے بابرکت آثار و نقوش کو گم گشتگیوں کی خاردار جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ نتیجتاً ذہنی جہالت اور حقیقت ناشناسی کی غلط اندازی نے سچی خداپرستی اور خالص جذبہ خداشناسی کو اجاگر نہیں ہونے دیا۔

دراصل معاملہ کچھ یوں ہے کہ نوع انسانی نے اول اول جب گہوارۂ فطرت میں آنکھیں کھولیں تو ایک ڈراؤنی دنیا اس کے سامنے تھی اور اس کی سلبی طاقتیں خوف و دہشت اور وحشت و اضطراب کے زیر و بم میں ابھرتی ڈوبتی معلوم ہوتی تھیں، بے آب و گیاہ لق و دق ریگزار عالم میں ایک نو وارد ہستی کا ظہور کائنات کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب وقوع تھا کیونکہ ایک طرف نخل حیات کی برومندی و شادابی کا فطری تقاضا چٹکیاں لے لے کر کسی متاع نادیدہ و پوشیدہ کا سراغ دے رہا تھا اور دوسری طرف عالم انسانیت اور غربت کدہ وجود کا یہ بے مایہ و گم گشتہ راہ مسافر قدم قدم پر کشمکش و اضطراب کی سرگوشیوں میں حیران و درماندہ تھا اس کا حال یہ تھا کہ منزل معدوم تھی اور راہ منزل میں قدم قدم پر آثار خوف و دہشت سے تصادم ہو رہا تھا۔

ایسی صورت حال میں شعوری اور وجدانی طور پر ایک بلند و بالا ہستی کا احساس حقیقت بھی ہے اور انسان کی فطری اور وجدانی بصیرت کا لازمی انعکاس و احساس بھی۔

کیونکہ فطرت انسانی کا اصلی وقیمتی سرمایہ و ورثہ یہی فطری احساس اور وجدان ہے جو ذوق سلیم کی دین ہے اور جو انسان کو ہر لحہ اس کی اصلیت وحقیقت سے روشناس کرانے کے درپے ہے اور اسی اصلیت وحقیقت کا صحیح علم اور اس پر یقین حق شناسی اور خداپرستی ہے۔

شاید اسی لئے مذاہب عالم میں ہر مذہب تصور الوہیت کا مبلغ ہے اور جہاں تک مذاہب کی حقیقی تعلیمات وہدایات کا تعلق ہے وہ تو بہر حال الٰہی تصور پر ہی مبنی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بانیان مذاہب کے بعد ان کے متبعین اور پیروؤں نے تصورات الٰہیہ کی جو شقیں اور نوعتیں انسانی ذہن ودماغ میں معتقدات کی شکل میں پیدا کیں کیا ان میں سے کوئی شکل قریب حقیقت بھی تسلیم کی جاسکتی ہے؟

دیگر مذاہب کے معتقدات:

یہ صحیح ہے کہ رہنمایان مذاہب کا ذاتی کردار ومنصب رشد ودعوت کا درجہ یقیناً بلند اور بابرکت تھا ان کی زندگی مظہر انوار حق تھی اور ان کا مشن سراسر الٰہی مشن تھا اور مبادیات ومقدمات کا ایک سلسلہ تھا جو اپنی بابرکت جدوجہد کی تکمیل کرتا رہا مگر ہم اسے خداپرستی اور خداشناسی کے اعتقادی پہلو تک ہی محدود پاتے ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب عالم میں صرف اعتقادی الوہیت اور تخیلی وحدانیت اجاگر رہی اور عملی توحید کی صحیح تعبیر سوا دین قیم یا شریعت فطریہ کے کہیں کارفرما نہیں اور یہی وہ نقطہ امتیاز ہے جو شریعت فطریہ (اسلام) اور دیگر مذاہب عالم کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔

بہتر ہوگا کہ اس فرق و امتیاز کو اور زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے ہم دیگر مذاہب کے بنیادی معتقدات کو بھی ہم اپنے سامنے رکھتے ہوئے چلیں۔

اس سلسلے میں پہلی منزل ہندوستانی تصور الوہیت کی ہے۔

ہندوستانی تصورالوہیت:

ہندوستان کی روداد مذہبیات کچھ مختلف تعلیمات وافکار کا پتہ دیتی ہے جن میں متعدد رہنمایان مذاہب کا سراغ ملتا ہے، یہ رہنمایانِ مذاہب آج ان کے ماننے والوں کی طرف سے جس انداز میں پیش کیئے جارہے ہیں وہ ماننے والوں کے محدود علمی اور تحقیقی ذوق کا بھی مظہر ہے اور اس کا ثبوت بھی کہ ہندوستانیوں کا اصل تصور الوہیت ''ہمہ اوست'' کی خطرناک گتھیوں میں الجھ کر رہ گیا۔

گیتا قدیم ہندوستان کے فلسفیانہ ذہن کی بہترین ترجمان ہے مگر ہندوؤں کا یہ قدیم ماخذ بھی بنیادی طور پر ہمہ اوست کی کرشمہ سازیوں کا ایک مظہر ہے۔ نتیجتاً ہندوقوم کیونکہ ہر مسیح جو دراصل مبلغ روحانیت تھا عوام کی اعتقادی نگاہ میں پہلے اوتار بنا اور عہد حاضر میں تو پورے کا پورا خدا بن چکا ہے۔

اوپنشدوں کا فلسفہ روحانیت تمام تر گیتا سے ماخوذ ہے اور مسئلہ وحدت الوجود کا سرچشمہ بھی یہی فلسفہ روحانیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس فلسفہ کی فلسفیانہ کمزوریوں نے طرح طرح کی غلط راہیں پیدا کردیں۔ نتیجتاً ہر وجود خدا بن گیا اور خواص چاہے اس کی دقیقہ سنجیوں سے جتنا بھی آشنا رہے ہوں لیکن عوام تو کھلے طور پر اصنام پرستی اور اوہام پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوگئے، اور شرک کی تمام لعنتیں جو انسان کو کبھی بھی بلند اخلاقی اور روحانی ارتقا سے تمتع کا شرف نہیں بخش سکتیں، عوام کے فکری محور کا جزو لاینفک بن گئیں۔

گوتم بدھ کا تزکیہ نفس:

اس کے بعد بدھ کے تزکیہ نفس کا تبلیغی دور سامنے آتا ہے، بعض محققین کے مطابق تو بدھ کی تعلیم میں تصور خدا کا کوئی معاملہ ہی نہیں ہے مگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اثبات کی راہیں بھی پیدا ہوتی نظر آتی ہیں کیونکہ بدھ کی تعلیم سر تا سر تزکیہ نفس سے متعلق ہے اور مادۂ ازلی ہی نفس و طبیعت کی حرکت و عمل کا سرچشمہ ہے۔

بدھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انانیت یعنی نفس خودی کو فنا[1] کر دیا جائے اور اس تعلیم کا دوسرا اہم پہلو رحم، محبت اور جذبہ ہمدردی سے متعلق ہے، کسی جاندار کو دکھ نہ پہنچانا بدھ کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہے۔

بدھ کی تعلیم میں گو ظاہری اور عملی طور پر وہ روح شامل نہیں ہے جسے خالص خدا پرستی کی راہ کہا جا سکے مگر اس کے باوجود گوتم بدھ جب مادہ ازلی (پراکرتی) کا ذکر کرتے ہیں تو ہم صرف لفظی تعبیر میں اختلاف پاتے ہیں، حقیقت میں کوئی تضاد نہیں پاتے، کیونکہ ہم امر الٰہی یا روح کی، نفس طبیعت کو درجہ حیات میں لانے والی قوت تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو بدھ کی تعلیم میں مادہ ازلی کہا گیا جو عرفان کے نچلے درجے کا نتیجہ ہے۔

انانیت کو فنا کر دینے کے بعد جو حقیقت انسان کے جوارح عمل پر نور افشاں ہوتی ہے وہ قرب الٰہی کی تجلیات ہیں جسے فہم و ادراک کے طبعی قصور کی وجہ سے گوتم بدھ نے "فنائے محض"، سمجھ لیا، نتیجتاً خالص خدا پرستی کی راہ یہاں بھی ناپید رہی اور خدا پرستی کا اصل مقصود بدھ کی تعلیم سے بھی حاصل نہ ہو سکا۔

وھذا سبیل الطاغوت!

---

[1] اس نظریئے کے بالکل برعکس علامہ اقبال اثبات خودی کی بات کرتے ہیں۔

مجوسی تصورالہ:

مجوسی تصورالہ کی بنیادی شق ثنویت پر مبنی ہے۔ نیکی کا سرچشمہ یزداں اور بدی کا سرچشمہ اہرمن ہے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مطلق العنان ہیں، نتیجتاً خیروشر کا دو الگ الگ محاذ قائم ہے، نوروسعادت یزداں کے حصے میں، گمرہی وتاریکی اور شقاوت و بدی کی ساری قوتیں اہرمن کے دامن میں!

آتش پرستی اور آفتاب پرستی پر یزدانی عبودیت کی بنیاد رکھی گئی کیونکہ یزدانی تجلیات کا سب سے بڑا مظہر، سرچشمہ منبع اور مخرج نور ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ زرتشت کا یہ فلسفہ بھی اپنے آپ میں نامکمل ہی ہے کیونکہ خدائی قوت کے دومتصادم مظہر کائنات میں موجود ہم آہنگی اور فطرت میں موجود توازن کا سبب نہیں بن سکتے، یہ ہم آہنگی کائنات اور توازن فطرت ہی چیخ چیخ کر فلسفہ ثنویت کو رد کر رہا ہے اور زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ نوراور ظلمت کے ان استعاروں کے اوپر بھی کوئی ایک اور صرف اعلیٰ ترین ہستی اور وجود کارفرما ہے اور اسی کے اشارے پر نوروظلمت کی یہ ساری کشاکش مصروف عمل ہے۔

افسوس کہ زرتشت کا فلسفہ اس اعلیٰ ترین ذات کا عرفان نہیں کراپاتا۔

یہودی تصورالوہیت:

یہودیوں نے قہروغضب اور غیض وانتقام کی تمام ہیبت ناکیوں کو خدا کے تصور سے وابستہ کردیا اور تخاطب الٰہیہ کو سرتاسر انسانی جذبات وصفات پر مبنی کر کے ادنیٰ درجہ کا تمثیلی اسلوب توریت مقدس سے متعلق کردیا اور اسے توریت مقدس کا غالب اور عام تصور قرار دیا، تحریف معانی اور تاویل ذہنی کی تمام دناءتوں کو اس تصور میں جزولاینفک کی

طرح شامل کر کے اصل روح و معانی سے کنارہ کشی اختیار کی اور اس طرح بغی و فساد اور سرکشی و انحراف کا راستہ اپنایا اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ:

ضربت علیهم الذلة والمسکنة وباء و بغضب من الله ولهم عذاب الیم. (ذلت اور ناداری ان سے چمٹ رہی ہے۔ اور اللہ کی طرف سے یہ غضب میں گرفتار ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے)

تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں نے بھی نصاریٰ کی طرح حضرت زبیر کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے توریت و زبور میں تحریف کے مرتکب ہوئے اور جب ان کو راہ راست پر لانے کے لئے اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث کیا تو انہوں نے ان پر ایمان لانے کے بجائے نہ صرف یہ کہ ان کی بات ماننے سے انکار کیا بلکہ حضرت عیسیٰ کے قتل کی کوشش بھی کی۔ کلام الٰہی قرآن مجید کے مطابق اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کی حفاظت کی اور انہیں اپنی طرف اٹھالیا مگر نصاریٰ کا الزام تو یہودیوں پر یہی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا۔

مسیحیوں کا تصور ابن اللہ:

اسی طرح مسیحیوں نے بھی حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کا درجہ دے کر حضرت عیسیٰ مسیح کی اصل تعلیم کو مسخ کر دیا، حالانکہ حضرت مسیح کی بعثت یک سر رحمت و محبت کا الٰہی پیام تھی جس کے متقضیات کو اگر صحیح طور پر اعتقادی اور عملی زندگی میں رچایا جاتا اور برتا جاتا تو رحمت و رافت کی تبلیغی جدوجہد اور تحصیل انسانیت کبریٰ کی کامل ترین سعادت سے ہر گوشہ حیات پر نور ہو جاتا کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نور ہدایت و شریعت فطریہ کے مبلغ تھے اور رسالت کی ان تمام بابرکت بہرہ مندیوں سے ہم کنار تھے جو کسی نبی یا رسول کو اپنی تعلیم و تزکیہ نفس و تجلی روح کی تبلیغ و تلقین میں درکار ہوتی ہیں۔

حضرت مسیح کا زمانہ بعثت ان تاریکیوں کا گہوارہ تھا جو نوع انسانی کو تیرہ بختیوں اور گم گشتگیوں میں مبتلا کئے تھیں اور نوع انسانی کی اکثریت قتل وخوں ریزی اور آپسی جدال وقتال میں مبتلا تھی۔

اور سب سے بڑی مکروہ بات یہ تھی کہ حاملین تعلیمات الٰہی انبیائے کرام کے ساتھ ہتک آمیز شقاوت کا سلسلہ جاری تھا اور پھر اس کے علاوہ بھی بنواسرائیل کی بے راہ روی نے ہلاکت وتباہی کی مختلف راہیں پیدا کر دی تھیں۔ حضرت مسیح نے ان اخلاقی بیماریوں کے انسداد کے لئے محبت ورافت اور رحمت وعنایت کی بابرکت راہ نجات قوم کے سامنے پیش فرمائی اور یقیناً حضرت مسیح کے زمانہ بعثت میں فتنہ وفساد کی راہیں مسدود کرنے کے لئے یہ بہترین الٰہی پیغام تھا۔ مگر چونکہ حضرت مسیح نے شریعت موسوئی میں کوئی خاص ردوبدل نہیں کیا اور نہ ہی شریعت فطریہ کی تکمیل حضرت مسیحؑ کے ذمہ تھی اس لئے حضرت مسیح کی تعلیم وتبلیغ میں کسی خاص شریعت یا ضابطہ وقوانین اخلاق کا ثبوت نہیں ملتا۔

حضرت مسیح کے بعد نام نہاد مسیحیوں اور حواریین نے اقانیم ثلثہ، کفارہ، مریم پرستی اور عقیدہ ابنیت مسیح کو حضرت مسیح کی اصل تعلیم مشتہر کر کے پیغام مسیح کو ایک عجیب وغریب معمہ بناڈالا جس نے سرتاسر تعلیم وتربیت اور جہد وعمل سے بے نیازی کو اپنا شعار بنالیا، قسیسین ورہبانین کی اس بوالعجبی اور کج روی وگمرہی نے تعلیم مسیح کا اصلی خدوخال کبھی دنیا کے سامنے آنے ہی نہیں دیا اور اعتقادی وعملی طور پر عیسائیوں کا کردار دوسرے مسخ مذاہب کے حلقہ بگوشوں سے کچھ مختلف نہ ہوسکا۔

نزول قرآن شریعت الٰہیہ کا تکملہ:

اب یہ بات ارباب بصیرت پر آفتاب حقیقت کی ضوریزیوں کے ساتھ

منکشف ہو چکی ہوگی کہ ہندومت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت اور عیسائیت تمام مذاہب کی اعتقادی فکر بانیان مذاہب کی بنیادی فکر سے کوسوں دور نکل کر بغی وفساد اور سرکشی و انحراف کی راہوں کی طرف مائل ہو چکی تھی، تاریخ شاہد ہے کہ بعثت محمدیؐ اور نزول قرآن کے وقت نوع انسانی مختلف حلقہ ہائے اعتقاد وتصور میں بٹی ہوئی تھی، سرزمین عرب اوراس کے چاروں طرف کی دنیا میں اوہام پرستی، اصنام پرستی اور اشخاص و مخلوقات کی صورت میں ان گنت معبودان باطل سے دنیا جہنم زار شقاوت وگمرہی بن گئی تھی اور جس طرح اس دور میں غلبہ شرک کے سبب خداؤں کا شمار ناممکن تھا اسی طرح مذاہب ومعتقدات ذہنی کی فہرست محال تھی، نوع انسانی کے کردار واعمال کی اصلاح و بلندی کا شعور مردہ ہو چکا تھا اور کوئی اعلیٰ نظریہ حیات نوع انسانی کے سامنے نہ تھا۔

بہیمیت و بربریت کا یہ دور یقیناً تاریخ انسانی کا ایک تاریک باب ہے اور اسی لئے قدرت کا یہ فیصلہ تھا کہ بعثت محمدیؐ اور نزول قرآن کی شریعتہ الٰہیہ فطریہ کا تکملہ وتتمہ بنا کر پیش کیا جائے تاکہ بنی نوع انسان خالص خداشناسی اور خداپرستی سے ہم کنار ہوکر انسانیت کی تکمیل جدوجہد کو بروئے کار لانے کی استعداد وصلاحیت سے مالامال ہو سکے۔ چنانچہ تمام نوع انسانی کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کوتسلیم وقبول کے لئے پیش فرمایا جاتا ہے:

"یاایھاالناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون الذی جعل لکم الارض فراشا وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقالکم فلا تجعلوا لله اندادا و انتم تعلمون." (پارہ اول، سورہ البقرہ)

(مطلب: ”اے افرادنوع انسانی! اپنے اس پیدا کرنے والے کی بندگی ومحکومی اختیار کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو اپنی قدرت کاملہ

کے ظہور وصدور سے پیدا کیا تا کہ تم اتقا کی زندگی حاصل کرو، وہ پیدا کرنے والا جس نے تمہارے اسباب حیات کی افزائش وفراوانی کے لئے زمین کو سطح فرش بنایا اور آسمان سے پانی برسا کر زمین کو اس سے ہموار کیا کہ کشت حیات کی برومندی کی استعداد نے طرح طرح کے پھل اگائے جو تمہاری روزی ہے، پس اللہ کے لئے کسی کو شریک نہ بناؤ کیونکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کی کسی صفت میں کسی غیر اللہ کے تخیل کو شریک کرنا سب سے بڑی معصیت ہے۔)

اسلام کے اس تصور الہ نے دنیا کی اعتقادی اور عملی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ظہور واسلام کے پہلے دنیا جن تصورات الوہیت سے روشناس تھی ان میں کا ہر تصور کسی نہ کسی انسانی خاصیت وصفت تک محدود تھا لیکن اسلام نے ان تمام برخود غلط تصورات کے برعکس ایک صاف وشفاف الٰہی تصور پیش کیا کہ اس سے بہتر کوئی دوسری تعریف ممکن ہی نہ تھی، فرمایا جاتا ہے کہ **لیس کمثلہ شیءٌ** (کوئی شئے اس کی طرح نہیں ہے)

قرآنی تصور توحید:

دیکھئے کیسا واضح تصور ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو تصور الوہیت بھی مادی وخلقی اشیا کے اتصاف کے ساتھ متصف ہوگا وہ ذات لم یزل کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ذات واحد مادہ عوارض اور اسباب وعلل کی تمام صفات مخلوق سے یکسر منزہ ہے، اور اس حیی وقیوم کی ذات یکتا ویگانہ اشیائے مخلوق کی مماثلت سے بلند اور مستثنیٰ ہے۔

اور اس بنیادی حقیقت کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں بھی اشارے کئے گئے ہیں اور انسانوں کی تعلیم کی گئی ہے۔

(۱) **والٰھکم اللہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم.**

(لوگو! تمہارا معبود صرف خدائے واحد ہے، اس رحمٰن و رحیم خدا کے سوا کوئی
اور معبود نہیں)

(۲) هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم.
(وہ سب سے پہلے ہے وہی سب کے بعد ہے وہی سب پر ظاہر ہے وہی
سب میں چھپا ہوا اور کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں)

(۳) كل شئ هالک الا وجهه له الحكم واليه ترجعون.
(اس کی ذات اور منشا کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ حکم صرف اس کا ہے
اور تم اسی کی طرف لوٹو گے)

(۴) ان الله لايغفر ان يشرک به ويغفر مادون ذالک لمن يشا.
(اللہ اس بات کو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس کی ذات وصفات میں کسی کو
شریک کیا جائے اور اس کے سوا وہ جو چاہے گا معاف کر دے گا)

(۵) فالحكم لله العلى الكبير.
(حاکمیت وخداوندی صرف بزرگ و برتر اللہ کے لئے ہے)

(۶) ان الله ربى و ربكم فاعبدوه هذا صراط مستقيم۔
(بے شک وہی خدائے بزرگ و برتر میرا اور تمہارا سب کا رب ہے، پس اسی
کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے)

(۷) ان الشرک لظلم عظيم۔
(بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے)

(۸) ان الحكم الا الله امروالا تعبدوالا اياه. ذالک الدين القيم
ولكن اكثر الناس لايعلمون۔
(اللہ کے سوا کسی کا حکم (حکم کی حیثیت نہیں رکھتا اس لئے وہ حکم حکم) نہیں ہے

اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ سوا اس کے کسی کی غلامی و محکومی اختیار نہ کرو۔ دین قیم یہی ہے، اگرچہ اکثر لوگ (دین کی اس اصل حقیقت کو) نہیں جانتے)

اور یہی تصور الہ اسلام کے بنیادی قوانین میں سے اول ترین قانون ہے۔

یہ قانون ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ قوت و حاکیت اور مالکیت و خالقیت کے تمام تصورات صرف خدائے برتر کی قدرت کاملہ سے متعلق مانے جائیں اور اس بارے میں معمولی سے معمولی بے راہ روی اور چوک بھی نا قابل فروگذاشت ہے۔

امت محمدی یا ملت ابراہیمیؑ:

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی تمام تر زندگی اور تبلیغی و عملی جدوجہد صرف اسی ایک نقطہ پر مرکوز تھی کہ عالم انسانیت کا ہر گوشہ ایک خدا کی خدائی کی روح میں ڈوبا رہے۔ اور اسی اصل عظیم سے بہرہ مند جماعت کو خدا کی سنت میں خیر امت یا امت مسلمہ کہا جاتا ہے، قرآن کریم اس خیر امت کو بار بار شرف تخاطب بخشتا ہے اور اعادۂ شرف وفضیلت سے شیرازۂ امت میں برکت وسعادت کی لہریں دوڑاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ملت ابیکم ابراهیم هوسمّٰکم المسلمین من قبل وفی هذا لیکون الرسول شهیداً علیکم و تکونوا شهداء علی الناس. فاقیموالصلوٰة و آتو الزکوة واعتصمو بالله. هو مولٰکم فنعم المولی و نعم النصیر. (پاره —۷)

(ترجمہ: تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت یہی ملت ہے کہ تمہارا نام مسلم رکھا گیا، تم سے پہلے بھی اور شریعت اسلام میں بھی، تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اعمال وافعال اور اخلاق وکردار کی دیکھ بھال فرمائیں اور تم نوع

انسانی کی رکھوالی کے اہل بنو، پس نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور اللہ کے ساتھ

مضبوطی کے ساتھ جڑے رہو)

حضرت ابراہیمؑ کی ملت، ملت حنیف سے تعبیر کی جاتی ہے اور دوسری جگہ بھی خدائے حیّ و قیوم نے حضرت ابراہیمؑ کی اس خصوصیت کبریٰ کا اظہار فرمایا ہے جو ان کی زندگی میں کارفرما تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ساری کائنات کو ٹھکرا کر اور سارے اسباب و وسائل سے کٹ کر اپنے آپ کو حضور خداوندی میں پیش فرمایا اور اپنی تمام تر نیاز مندیوں اور بندگی کے خالص احساس و اظہار کے ساتھ بارگاہ حقیقی میں سر عبودیت کی سجدہ ریز تمناؤں کا جو ہدیہ پیش فرمایا وہ ایک پر سرور کیفیت کا حامل ہے۔

کیسا عجب منظر ہوگا کہ مناظر فطرت سے حضرت ابراہیم کی طلب شعار نگاہیں دوچار ہوئیں اور جب رات کے اندھیروں نے ان کو چھپا لیا تو انہوں نے دیکھا کہ تارے جگمگا اٹھے ہیں اور بزم کہکشاں کچھ عجیب حسین سماں پیدا کر رہی ہے، حضرت ابراہیم کے دل کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور ازدیاد ذوق طلب نے کچھ ایسی کیفیت پیدا کی اور وفور طلب واضطراب نے ان کے حال پر وہ رنگ پیدا کیا کہ وہ کہہ اٹھے کہ:

"میں جس کی راہ تک رہا ہوں اور ہر ہر لمحہ حیات جس کی جستجو میں
سرگرداں ہے، معلوم ہوتا ہے، ان چمکتے تاروں میں وہی کارفرما ہے۔"

لیکن جب یہ تارے ماند پڑنے لگے تو جادۂ حقیقت کے اس اولوالعزم راہی نے کہا:

لا احب الأفلین

(میں زوال پذیر ہونے والوں کو نہیں چاہتا)

پھر جب چاند روشن ہوا تو اسی ازدیاد طلب و شوق میں کہہ اٹھے کہ یہ میرا

مطلوب و رب ہے کیونکہ بڑی چمک والا ہے، اس ابراہیمی کیفیت کو قرآن کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

فلما رأ القمر بازغاً قال هذا ربی

لیکن جب چاند کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگی تو بے تابانہ چیخ اٹھے "**لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضالین**"۔ (رب حقیقی نے اگر میری دست گیری نہ فرمائی تو میں یقیناً گم کشتگان راہ میں ہو جاؤں گا)

اور پھر ایک نیا منظر سامنے آتا ہے، پردۂ شب کو آفتاب کی ضیاء بار کرنیں چاک کر ڈالتی ہیں اور افق مشرق سے شعاع آفتاب زو پاشیاں کرتی نمودار ہوتی ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں:

"هذا ربی هذا اکبر"

لیکن اس سب سے زیادہ روشن مخلوق، کا بھی وہی حال ہوا جو دوسری خلقتوں کا ہو چکا تھا اور تب حضرت ابراہیمؑ کی آوازۂ حق بلند ہوتی ہے:

یا قوم انی بری مما تشرکون.

(اے میری قوم! میں ان تمام اسباب وعلل سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم اللہ کا شریک کرتے ہو)

انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین.

(میں نے اپنے آپ کو اور اپنی کائنات قلب وحیات کے ہر گوشے کو ہر طرف سے پھیر کر اور علت وسبب کو ٹھکرا کر صرف اس کی عبودیت و بندگی کو اپنایا ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور اسی لئے میں صفات خداوندی میں سے کسی صفت کے ساتھ بھی کسی غیر خدا کو شریک کرنے والا نہیں)

برسبیل تذکرہ یہ عرض کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ صرف حضرت ابراہیمؑ ہی نہیں، ان سے پہلے بھی جو جو انبیائے کرام خلعت رسالت سے سرفراز فرما کر مبعوث کئے گئے ان سب کا مبلغ نظر توحید ذات وصفات کا سرچشمہ حقیقت بنا۔

اور غور سے دیکھا جائے تو ابتدائے آفرینش میں بھی سب سے اہم نقطہ یہی تھا کیونکہ شعور وفطرت انسانی کو اگر اس اصل عظیم سے روشناس نہ کرایا جاتا اور انسانی ضمیر کے اس جذبہ حق شناس کے عرفان و وقوف پر تمام قوت صرف نہ کی جاتی تو ذات الٰہی کا حقیقی تخیل ظہور میں نہ آتا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان حاملین تبلیغ و ہدایت کی اصل پونجی اس حقیقت کبریٰ کے ساتھ ان جزئیات پر شامل تھی جو تدریجی وضمنی مراتب وحیثیات سے متعلق تھے اور کارخانہ حیات کا ضبط ونظم اور تشکیل وترتیب کی خوش اسلوبیوں سے بہرہ مند ہونا بغیر ان تدریجی وضمنی مدارج کے ناممکن تھا۔

انسان کے شعور وجدان نے اول اول خدا کو پالنہار کے روپ میں پایا اور نوعیات وتصورات میں جتنی بھی ٹھوکریں اس نے کھائی ہوں، مگر خدا کی ربوبیت اور مظاہر فطرت و آثار قدرت سے وہ کسی طرح منہ نہ موڑ سکا، اور ربوبیت ہی اولین تعارف حق وحقیقت ہے اور اسی لئے قرآن کریم نے بار بار مظاہر ربوبیت وآثار قدرت کی طرف انسانی فکر ونظر کو مبذول ہونے کا رجحان پیدا فرمایا ہے۔

کماقال موسیٰ من فرعون. ربنا اعطی کل شیٔ خلقه ثم هدیٰ فذلکم الله ربکم الحق. فما ذابعدالحق الا الضلال فانی. (پارہ-۱۶)

صحائف خداوندی اور آیات خداوندی پر بنظر تعمق غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ پہلے پہلے تمام کے تمام انبیاء و مصلحین اور معلمین الٰہیات نے صرف توحید ذات کا فلسفہ نوع انسانی کے سامنے پیش فرما کر کارخانہ عمل کا سب سے پہلا اور اہم نقطہ سامنے لانے کی مساعی فرمائی ہیں اور اس بارے میں مجموعی طور پر جو بات سامنے آتی

ہے وہ مختلف مدارس الٰہیات میں نوعی موشگافی ہے کیونکہ حقیقی اعتبارات جو ان کی تعلیمات کے بنیادی نقطے تھے سرتا سر وہی ہیں جن کو توحید ذات اور فلسفہ وحدت وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن خود ان حاملین ہدایت وسعادت پر یقیناً یہ بات مخفی نہ تھی کہ الٰہیات کا یہ درجہ جو ان کے حصہ میں آیا چند در چند نزاکتوں اور الجھنوں کا سرچشمہ ہے (اسی کو آج کی اصطلاح میں کج روی بھی کہا جا سکتا ہے) اور یہی وجہ ہے کہ ہر ہادی و مصلح نوع انسانی کی مظاہر فطرت کی پرستاری سے نالاں وترساں رہا۔

تاریخ مذاہب شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے جو انبیاء مبعوث ہوئے وہ کسی نہ کسی خاص نقطہ پر مرکوز رہے اور دین الٰہی کی تبلیغ میں کامل طور پر سرگرم رہے اور طبیعات و ریاضیات وفطریات مختصر یہ کہ مختلف ارتقائی و تدریجی مدارج الٰہیات مذاہب حق کی تبلیغ وتشکیل کے کام آتے رہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ مظاہر فطرت کے یہ مختلف شاخسانے (انسان کی طبعی گمرہی کے سبب) خدا پرستی کی شکل بگاڑتے رہے اور شاید اسی لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا سے بار بار اس خطرناک گمرہی کی تباہ کاریوں کا اعادہ فرمایا:

واذقال ابراهیم لابیه اٰذرا تتخذ اصناماً اله انی نرنک لقومِک فی ضلال مبین.

(مطلب: (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا کیا تم ان فرضی معبودوں کو اصل معبود کی طرح الٰہ بناتے ہو، یقیناً میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی گمرہی میں مبتلا دیکھ رہا ہوں)

حضرت ابراہیمؑ کا یہ ارشاد ان کے عہد کے ان حالات واختیارات کو صاف صاف پیش کر رہا ہے جو ان سے پہلے نوع انسانی کے معتقدات واعمال حیات میں کارفرما تھے اور حضرت ابراہیمؑ نے جس گہوارے میں آنکھیں کھولیں اس کا ہر گوشہ اور عہد

ابراہیمی کا ہر حلقہ اس مظاہر پرستی اور اصنام پرستی کو خدا پرستی سمجھ بیٹھا تھا مگر ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس سارے کارخانہ کفر و گمرہی پر خدا پرستی کا فریب ثبت تھا پس فی الحقیقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے عہد کے تمام جھوٹے خداؤں کو جوان کے زمانے میں ان کی بعثت کے پہلے سے نوع انسانی کے ذریعہ پوجے جارہے تھے مشاہدہ وحقیقت کی روشنی میں لاکران سب کا تجزیہ فرمانا شروع کر دیا تھااور خدائے لم یزل حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ یہ ثابت فرمارہا تھا کہ تغیر وتبدل اور طلوع وغروب کا اثر قبول کرنے والا کوئی وجود خدا نہیں ہوسکتااور دراصل سنتہ ابیکم ابراہیم کا یہی مفہوم ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے باطل پرستوں کے تمام تصورات و معتقدات کو یک سر گمرہی و بطلان بتلا کر خالص خدا پرستی کا اعلیٰ تخیل پیش فرمایا اور اسی تصور پر نوع انسانی کی فوز وفلاح کا ایک اعلیٰ ترین ضابطہ و دستور مرتب فرما کر تمام نوع انسانی کو اس کے تسلیم و قبول کی دعوت دی اور اسی صداقت عظمیٰ کو تسلیم کرنے والی جماعت کو ''امت مسلمہ'' اور ''ملت حنفی'' کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء و مصلحین اور ہادیین و مبلغین تشریف لائے سب اسی دین حنیفی اور ملت ابراہیمی کے موید و مبلغ رہے۔

امت محمدیؐ تمام امتوں کا تتمہ:

پس دراصل امت مسلمہ تتمہ وتکملہ ہے ان تمام تعلیمات الٰہیہ کا جو ہر زمانہ، ہر قوم، ہر ملک میں مختلف زبانوں مختلف زمانوں اور مختلف رنگ ونسل میں نوع انسانی کی کامل ترین فوز وفلاح کے لئے ظہور پذیر ہوتی رہیں اور آدمؑ وادریسؑ سے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام تک فرداً فرداً جس پیغام حق کی تبلیغ وتعلیم فرمائی گئی وہ مجموعی طور پر ملت حنیفی کے حصے میں آ گئی اور اسی لئے قرآن کریم اخرجت للناس اور تکونوا شہداء علی الناس کہہ کر

اس کی اصلی حیثیت و ذمہ داری واضح فرمادی۔

لہٰذا جزئیات مذاہب میں جتنے بھی اختلاف پیدا ہوں لیکن مذہبیات کا اصل نقطہ ہر حلقہ اعتقاد میں وہی ہے جسے خداپرستی و خداشناسی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور ملت ابراہیمی کی بنیادی و اساسی متاع گرانمایہ یہی ہے اور خود قرآن کریم نے اسے اسوہ ابراہیمی سے تعبیر فرمایا ہے:

قد كانت لكم اسوة حسنة فی ابراهيم والذين معه اذقالو لقومهم انابرا ء منكم ومماتعبدون من دون الله.

(مطلب : تمہارے لئے بہترین نمونہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ہے جیسا کہ ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے طریقوں سے بیزار ہوں اور ان سے بھی جن کی تم عبادت کرتے ہو، اللہ کے سوا)

اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اکمل ترین پیغام حق کو جو حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ حسنہ کا سب سے اہم نقطہ امتیاز تھا، اپنا اسوہ بنالیا، لہٰذا قرآن نے نبی کریمؐ کے اسوہ حسنہ کے لئے بعینہ وہی الفاظ استعمال فرما کر امت مسلمہ کو ان کی اطاعت و پیروی کی طرف متوجہ فرمایا۔

لقد كان لكم فی رسول الله اسوة حسنة الخ

(بیشک تمہارے لئے اخلاق کا بہترین نمونہ رسول اکرمؐ کی ذات گرامی میں موجود ہے)

اسلام تمام مذاہب اور انبیاء کا مصدّق:

ملت ابراہیمی اور دین حنیف کی اسی بنیادی شق سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے

کہ بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فاراں کی چوٹی سے نوع انسانی کو قبول اسلام کی دعوت دی تو وہ دراصل تمام مذاہب وملل کے انکار کے مترادف نہیں تھا کیونکہ دعوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اصل مرجع وہی تھا جسے حضرت ابراہیمؑ کے قلب سلیم و مطمینہ نے اجاگر فرمایا تھا اور جسے تمام داعیین الہیات نے مرکز تبلیغ ودعوت قرار دیا تھا اور اسلام بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل کی اسی دعوت کی تکمیل اور نشاۃ ثانیہ کا علمبردار تھا، سچ یہ ہے کہ اسلام دنیا کا تنہا مذہب ہے جو دوسرے تمام مذاہب کا جامع بنا کر پیش کیا گیا اور اسی لئے اسلام کا ہر قانون ساری نوع انسانی کی فلاح کا ضامن ہے۔

غور کیجئے کہ اسلام نے سب سے پہلے ماضی کے تمام شرائع الٰہیہ اور مذاہب حقہ کی تصدیق فرمائی جو وقتاً فوقتاً ہر زمانہ اور ہر ملک وقوم میں حاملین رشد وہدایت کے توسل سے اترتے رہے اور انسانوں کو صحیح راہ عمل سے روشناس کراتے رہے، اس سلسلے میں قرآن کریم کے ارشادات گرامی ملاحظہ ہوں:

(۱) **ولقد بعثنا فی کل امته رسولا ان اعبدوالله واجتنبو الطاغوت.** (۱۶-۳۸)

(مطلب: اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک رسول مبعوث کیا جس کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطانی قوتوں سے بچو)

(۲) **وکم ارسلنا من بنی فی الاولین** (۴۳:۵)

(مطلب: اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلے زمانے کی قوموں میں مبعوث کئے)

(۳) **ولقدارسلنا رسلامن قبلک منهم من قصصنا علیک و منهم من لم نقصص علیک۔** (۷۸:۴۰)

(مطلب: اور ہم نے آپؐ سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کئے ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں نہیں سنائے)

(۴) وان من امته الا خلافیها نذیر۔

(مطلب: کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ کی طرف سے ڈرانے والا نہ آیا ہو)

(۵) ذلک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰة و مما رزقنهم ینفقون والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

(مطلب: اس کتاب میں کوئی شک نہیں، یہ چراغ ہدایت ہے ان متقیوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں جو ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو آپ پر اتاری گئی اور ان تمام کتابوں پر جو آپ سے پہلے اتاری گئیں)

(۶) امن الرسول بما انزل الیه من ربه والمومنون کل آمن بالله وملئکته و کتبه و رسله. لا نفرق بین احد من رسله.

(پ:۳ آل عمران)

(مطلب: رسول اکرمؐ ایمان لائے اس حقیقت پر جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی اور تمام مومنین بھی ایمان لائے ان تمام صداقتوں پر جو اللہ کی جانب سے اتاری گئیں اور فرشتوں پر اور اللہ کی جانب سے بھیجے گئے رسولوں پر ایمان و یقین فرمایا جو وقتاً فوقتاً نوع انسانی کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ہم رسولوں میں سے کسی رسول کے مبلغ ہدایت کے بارے میں کوئی تفریق نہیں کرتے)

(۷) الم یاتکم نبؤالذین من قبلکم قوم نوح و عاد و ثمود و الذین من بعدهم لایعلمهم الا الله جاء تهم رسلهم بالبینت فردوا ایدیهم فی افواههم. (۹:۱۶)

(مطلب: تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں کیا تم تک ان کی خبر نہیں پہنچی؟ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اور وہ قومیں جو ان کے بعد ہوئیں، جن کی ٹھیک ٹھیک تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ان سب میں ان کے پیغمبر سچائی کی روشنیوں کے ساتھ مبعوث ہوئے مگر انہوں نے جہل و سرکشی سے ان کی تعلیم ان پر لوٹا دی اور کان دھرنے سے انکار کر دیا)

(۸) شرع لکم من الذین ما وصیٰ به نوحا والذین اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیه. (۱۳:۶۲)

(مطلب: اور اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ (شریعت) قرار دی جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا، اس لئے دین قائم کرو اور اس سلسلے میں الگ الگ نہ ہو جاؤ)

(۹) وما ارسلنا من قبلک من رسول الانوحی الیه انه لااله الا انا فاعبدون۔ (۲۱:۲۶-۲۵)

(مطلب: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو)

(۱۰) نزل علیک الکتب بالحق مصدقا لما بین یدیه وانزل التورات والانجیل من قبل هدی للناس۔ (۳:۳،۶)

(مطلب : اللہ نے آپؐ پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری ہے جو تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے توریت اور انجیل نازل کی تھی)

(۱۱) یہی نہیں حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ہر پیغمبر، مصلح اور ہادی نے بس ایک ہی تعلیم دی: **یٰقوم اعبدو اللہ مالکم من الٰہ غیرہ**۔ (صرف اللہ کی بندگی کرو اور کسی دوسرے کی نہیں)

لہٰذا مذکورہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں یہ بات بہت اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام ان تمام تعلیمات الٰہیہ وحقہ کا موید و مصدق ہے جن کی بنیاد حق و صداقت پر رہی اور اسی لئے وحی الٰہی نے نبی کریمؐ کی اس خصوصیت کبریٰ کا خاص انداز میں اظہار فرمایا ہے کہ آپ تمام دوسرے انبیاء کے مصدق ہیں اور آپؐ کی تصدیق ان کی نبوت کی صداقت پر حجت قرار دی گئی۔

پس قبول اسلام کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام صداقتوں اور مختلف وقتوں میں بھیجے جانے والے تمام انبیاء و رسل اور کتب و مذاہب سماویہ پر ایمان لایا جائے اور انکار اسلام کا مطلب ہے تمام مذاہب حقہ کا انکار، کیوں کہ دنیا کی تاریخ میں حق و صداقت کے نام سے جو کچھ امم ماضیہ میں حاملین ہدایت کے توسل سے آیا وہ دراصل اسلام کا جزئی مرقع تھا اور اسی لئے آج کوئی مسلمان ماضی کی ان صداقتوں کی تصدیق کئے بغیر کامل مسلمان نہیں ہوسکتا۔

سچ یہ ہے کہ قرآن جب کسی نبی کا ذکر کرتا ہے تو اس سے خاص طور پر یہ مراد ہوتی ہے کہ اس نبی کی تبلیغی جدوجہد کے مالہ و ماعلیہ کا پورا خدوخال انسان کے سامنے آجائے تاکہ اس سے موعظت وبصیرت کے تمام دروازے انسان پر وا ہو جائیں اور اسی طرح جب کسی قوم کی نافرمانی وسرکشی کا بیان ہوتا ہے تو تخریب و ہلاکت کے تمام

پہلوؤں پر ایک بلیغ تبصرہ ہوتا ہے جو نوع انسانی کو گمراہی سے بچانے کی غرض سے کیا جاتا ہے، یہ طرز بیان منطقی ہے اور اس کا بہتر نتیجہ ایک فطری عمل!

مطالعہ کے دو خاص پہلو:

مگر اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر ذہن نشیں کرنے کی ہیں کیونکہ ان کے ادراک کے بغیر اس راہ کی مشکلیں اپنی جگہ پر باقی رہ جائیں گی۔

پہلی اہم بات یہ کہ حضرت آدمؑ، وشیثؑ، اور حضرت نوحؑ و ادریسؑ علیہم السلام کے حصہ میں جو دور بعثت وتبلیغ آیا وہ سرتاسر ہنگامی تھا۔

اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بعثت دراصل ارتقائے ذہنی کی وہ دوسری منزل ہے جہاں سے ہدایت الٰہی انسانی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ہدایات کا انداز تبدیل فرماتی ہے اور ایک عالمگیر نظام حیات کا تصور پیش کرتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ملت ابراہیمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

آیئے ان دو بنیادی حقائق پر کچھ تفصیلی گفتگو کی جائے:

حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے عہد کے بارے میں غور فرمایئے تو احساس ہوگا کہ نوع انسانی مظاہر فطرت کے افادی وسلبی تاثرات میں گھری تھی اور عالم رنگ وبو کے ہر ہر ذرہ میں کرشمہ بار اور معجز نما فطرت اس عہد کے معصوم[۱] آدمی کے لئے تحیر کا سبب تھی، ان جیتے جاگتے معجزوں نے حیرت واستعجاب کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کردیا اور اس عالم تغیر میں تحول وانقلاب کا جو قانون کام کررہا تھا اس نے ہر ہر قدم پر ٹھٹھکا دینے والے اور مبہوت وششدر بنا دینے والے نت نئے رنگ وروپ سے کارگہہ حیات میں زیر وبم کی ایک عجیب خلش پیدا کردی۔

۱۔ Innocent & Ignorent دونوں معنی لیا جا سکتا ہے (حسین)

آفتاب کا طلوع وغروب، روز وشب کا سلسلہ لامتناہی، تاروں کا چمک چمک کر ڈوب جانا، چاند کی صاف وشفاف کرنوں سے باغ وبہاراں کے حسن اور جلوۂ دل آویزی کا نکھار، پہاڑوں کا ڈراؤنا پیچ وخم، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کا دفعتاً ابھرنا اور خس وخاشاک کو بے رحم قزاق (یا مہربان نظافت پسند) کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ کر بہالے جانا اور اس قسم کے نوموجود حادثات کا نومولود انسان کی دنیا میں خود بخود صادر ہونا اور خود ہی محو ہو جانا۔ نوع انسانی کی حس اجتماعی کے لئے ایک سامان عبرت تھا کیونکہ ابھی ابھی جس قافلہ وجود نے گہوارۂ فطرت میں آنکھیں کھولی تھیں اس کے اردگرد ایک ایسی پراسرار فضا ہالہ بنائے ہوئی تھی جس کے معیار سے بچ نکلنا اور جس سے انحراف وبے رخی برتنا ناممکن تھا۔ مظاہر فطرت کی اس حکمرانی میں انسان کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نجات نہیں تھی کہ وہ بغیر کسی کامل ترین فہم وشعور کے ان قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اسی لئے کبھی اس نے آفتاب کے آگے عقیدت کے پھول پیش کئے اور کبھی چاند تاروں کو معبود بنا کر تسکین حاصل کی اس طرح مظاہر فطرت کی گوناگوں رنگینیوں نے انگنت خداؤں کی دنیا پیدا کردی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ابناء جنس یا نوع انسانی کے اسی غلط جذبہ عبودیت اور اپنے زمانے کے غلط اعتقادی اختیارات کو تجزیہ وتحلیل کی روشنی میں حل فرمایا جسے قرآن کریم نے:

''حضرت ابراہیم کو زمین وآسمان کی بادشاہت دکھلانے'' سے تعبیر کیا ہے۔

وحی الٰہی کے ذریعہ صدہا مقامات پر مظاہر فطرت ان افادی وسلبی پہلوؤں کو واضح فرما کر حضرت سیدنا ابراہیم کا تشخص نبوت اور آپ کے پہلے کی دنیائے مظاہر پرستی کا مرقع پیش فرمایا گیا ہے۔ جو بجائے خود نوع انسانی کی اخلاقی وذہنی بلندی وپستی اور شعور ووجدان کی کمتری کی کامل تاریخ ہے اور مصالح وحکمت کا ایک لاانتہا سلسلہ اس میں قائم ہے کیونکہ مختلف ادوار میں نوع انسانی جس جس رنگ وروغن کو اپناتی رہی ہے

اس کا ہر شعبہ انسانیت کی تکمیل کے لئے از حد ضروری ہے اور خود قرآن کریم کی عدیم المثال معجز نمائیاں اس پر دال ہیں۔

وحی الٰہی نے ان مظاہر فطرت کو معرفت حقیقت کے لئے کھلی ہوئی نشانی قرار دیا ہے اور حق یہ ہے کہ فطرت کا تمام کارخانہ رنگ و بو اس فاطر السموت والارض کا پتہ دیتا ہے:

وکاین من ایته فی السموت والارض یمرون علیها وهم عنها معرضون. (۱۲:۱۰)

(اور آسمان و زمین میں انگنت نشانیاں معرفت حق کی موجود ہیں، انسان کی جہالت ہے کہ وہ اس پر سے صبح و شام گذرتے ہیں اور اس کی اصل پر نظر نہیں کرتے)

پھر سورۂ روم میں فرمایا جاتا ہے:

ومن آیته یریکم البرق خوفاً و طمعاً و ینزل من السماء ماءً فیحیی به الارض بعد موتها. ان فی ذلک لایات لقوم یعقلون.

(اور اس کی (قدرت و نمو فطرت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ (کالے کالے ڈراؤنے بادلوں میں) بجلی کے (ہیبت ناک) شعلے نمودار ہوتے ہیں اور اس سے تم پر امید و خوف کی (دو متضاد) کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور پھر وہ (فاطر السموت والارض) آسمان سے پانی برسا دیتا ہے پس اس پانی سے مردہ زمینیں دوبارہ جی اٹھتی ہیں۔ اور بے شک ارباب عقل و بصیرت کے لئے ان معجزات فطرت میں معرفت حق کی بڑی نشانیاں ہیں)

پھر ایک اور آیت میں فرمایا جاتا ہے:

والشمس و القمرو النجوم مسخرات بامره الاله الخلق و الامر

تبارک اللہ رب العالمین ادعو ربکم تضرعاً و خفیہ انہ لایحب المعتدین۔

(اور چاند سورج اور تارے خالق اکبر کے معجزہ خلق وامر کے کرشمے ہیں
بلند و برتر ہے وہ اللہ جو سارے عالموں کا رب ہے اور تم اپنے پالنے والے کو
تضرع کے ساتھ پکارو کیونکہ اللہ سرکشوں کو دوست نہیں رکھتا)

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کا یہ نقشہ جو قرآن کریم نے پیش فرمایا ہے یہ سرتاسر حضرت ابراہیمؑ کے اس تاثر کا موید ہے جو آپ نے وقتاً فوقتاً ابناء قوم و افراد وطن کی مظاہر پرستی کے لغو و مذموم اور باطل شعار پر اپنی بیزاری و نفرت کے طور پر بار بار ظاہر فرمایا اور وقت کے ایک ایک غلط تاثر یا باطل خداؤں کا تجزیہ و تحلیل فرما کر شرک و گمرہی کے تمام پہلوؤں پر لعنت و نفریں کی کراری ضرب لگائی اور اپنے آپ کو ایک خدا کے حضور میں کامل بندگی و جذبہ انابت کی متاع گراں مایہ کے ساتھ پیش فرمایا اور : انی وجہت وجہی للذی فطر السموت و الارض حنیفا و ما انا من المشرکین کے اعلان و اظہار کے ذریعہ خالص توحید، اکمل ترین عجز و بندگی اور اصح ترین تعبد و محکومی کا سنگ بنیاد نصب فرمایا جسے کتاب حکیم نے ملتہ ابیکم ابراہیم کے معزز لقب سے تعبیر فرمایا ہے۔

لہٰذا حضرت آدمؑ و شیثؑ اور حضرت نوحؑ و ادریسؑ علیہم السلام کے اس ابتدائی دور کے بعد (جس کا تذکرہ صفحات ماقبل میں گذر چکا) گفتگو کا یہ دوسرا پہلو ملت ابراہیمی کے تعارف سے متعلق ہے۔

پس عرض یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد تمام انبیاء و مرسلین کے لئے دعوت و تبلیغ کا نقطہ ارتکاز (Central point) وہی سنت ابراہیمی رہی جس کے لئے قرآن کریم نے دین حنیف کا سرنامہ پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیات مقدسہ

اس حقیقت کا اظہار فرماتی ہیں کہ آل ابراہیمؑ میں سے تمام کے تمام انبیاء اور بنو اسرائیل کے سارے معلمین حق وصداقت اسی حق وصداقت کی صراط مستقیم کے داعی رہے جس پر اول اول کلد ان کے موحد اول نے نوع انسانی کو انی وجہت وجہی للذی فطر السموت والارض حنیفاً وما انا من المشرکین کے حقانی اعلان کی روشنی میں دعوت دی تھی (اور اسی لئے مبلغین حق وہدایت کے میر کارواں حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام قرار پاتے ہیں) جنہوں نے اپنی آل اولاد کو وصیت فرمائی:

ووصیٰ بها ابراهیم بنیه ویعقوب یا بُنیّ ان الله اصطفیٰ لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون.

(اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے منتخب کرلیا ہے تمہارے لئے اس دین حنیف کو پس تادم آخر (موت نہ آئے تم کو لیکن اس حال میں کہ) تم مسلم رہو)

حضرت ابراہیمؑ کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کی رحلت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو آخری تلقین یہی فرمائی کہ وہ اسی شریعت الٰہیہ پر استقامت اختیار کریں۔ قرآن کریم نے حضرت یعقوب کی اس وصیت کا ان الفاظ میں اعادہ فرمایا ہے کہ:

ام کنتم شهداء اوحضر یعقوب الموت اذقال لبنیه ماتعبدون من بعدی. قالو انعبد الهک و اله آبائک ابراهیم و اسمٰعیل و اسحٰق الهاواحداً ونحن له مسلمون.

(پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب کے سرہانے موت آ کھڑی ہوئی اور انہوں نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس

کی بندگی کرو گے تو سب نے یہی کہا کہ ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے
جس کی آپ نے عبادت کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق نے
عبادت کی اور ہم اس کے فرمانبردار (یعنی مسلمان) ہیں)

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی جتنے انبیائے کرام مبعوث ہوئے ان سب کی تعلیم و تلقین اسی سنت ابراہیمی پر مرکوز رہی جسے قرآن پاک میں کہیں دین حنیف کہا گیا اور کہیں اسلام کے نام سے متعارف کرایا گیا اور اسی لئے جب یہودیوں اور نصرانیوں نے حضرت ابراہیمؑ کو صرف یہودیت اور نصرانیت کے نبی کے طور پر متعارف کرانے کی باطلانہ کوشش کی تو اللہ نے قرآن پاک کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ:

وقالو کونوا هوداً او نصریٰ تهتدو قل بل ملة ابراهیم حنیفا وما کان من المشر کین.

(یہود ونصاریٰ لوگوں سے الگ گروہ بندیوں میں شامل ہونے کی تلقین
کرتے ہیں اور یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ اور نصرانی کہتے ہیں کہ
نصرانی ہو جاؤ تب ہی ہدایت یافتہ ہوسکو گے تو کہہ دو کہ خدا کا دین گروہ
بندیوں میں نہیں ہے بلکہ اسلام (جو ایک عالمگیر نظام حیات ہے وہ تو دراصل)
ملت ابراہیم ہے اور ہم (مسلمان) اب مشرکوں میں سے نہیں ہو سکتے)

اور اسی لئے دوسری جگہ واضح طور پر یہ بھی ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ:

ومن یرغب عن ملته ابراهیم الامن سفه نفسه الخ

(اور کون ہے جو ملت ابراہیمی کے قبول سے اعراض برتے (کیونکہ دین
فطرت تو یہی ہے) سوا اس کے، جس کے نفس نے حماقت و جہل کا ارتکاب
کیا ہو)

اہل کتاب اور دین ابراہیم:

اہل کتاب اس مسئلے پر آپس میں جھگڑتے رہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا دین کیا تھا کیونکہ ان کی گمراہی وسرکشی نے دین الٰہی کی حقیقت کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اپنی اس کج روی کی وجہ سے وہ اللہ کے دین کو ایک خاص حلقہ واثر میں محدود دیکھنا چاہتے تھے۔قرآن کریم نے ان کا ردفرما کر یہ ٹھوس حقیقت ظاہر فرمائی کہ:

یا اھل الکتاب لم تحاجون فی ابراھیم و ما انزلت التوراۃ والانجیل الا من بعدہ افلا تعقلون.

(اے اہل کتاب! حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات وانجیل نہیں نازل کی گئیں مگر (حضرت) ابراہیمؑ کے بعد، پھر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے)

ظاہر ہے کہ صاحب تورات وحامل انجیل علیہما السلام کی بعثت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت مبارکہ کے کئی سو سال بعد ہوئی، پھر قرآن کریم کا بار بار اس حقیقت پر زور دینا اور یہودیوں اور نصرانیوں کی تردید کرنا کہ حضرت ابراہیمؑ تمہاری طرح کسی مخصوص حلقے کے مبلغ و ہادی اور پیغمبر نہیں تھے بلکہ ان کی تعلیم سرتاسر دین فطرت یا شریعت الٰہیہ کی تعلیم تھی جس کی بنیاد خالص توحید خداوندی پر تھی اور جو ساری نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کے لئے الٰہی پیغام تھی۔

ماکان ابراھیم یھودیاً و لانصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً وما کان من المشرکین.

(حضرت ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہ دین حنیف کے ماننے والے اور پھیلانے والے تھے اور مسلمان تھے اور کسی لحاظ سے بھی شرک

کرنے والوں میں سے نہیں تھے)

اسی طرح سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کی اکثر و بیشتر آیات مقدسہ ایسی ہی بعض نا قابل انکار حقیقتوں کا اعادہ کرتی ہیں اور سچ یہ ہے کہ انہی بیش بہا جواہر پاروں میں امم ماضیہ اور معروف و غیر معروف مذاہب کی بڑی واضح تصویریں سامنے آجاتی ہیں جس سے دین الٰہی کی ہمہ گیر صداقت اور شریعت فطریہ کی یک رنگی و ہم آہنگی کی بے پناہ وسعتوں کا پتہ ملتا ہے اور دین قیم جسے قرآن کریم میں فطرت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ابتدائے آفرینش سے بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک کس کس طرح جلوہ فرما ہوتا رہا ہے اس کا مفصل مرقع خود قرآن کریم کی صداقتوں میں موجود ہے۔ عیسائیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ، حضرت اسحٰقؑ کی اولاد سے تھے اور شریعت موسوی اور تورات کے اشعار حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بنو اسرائیل کا چشم و چراغ کہتے ہیں اور خود قرآن کریم بھی بار بار اسی حقیقت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور ان حضرات سے پہلے کی صورت حال یہ ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم کے ظہور و بعثت میں جو حقیقت دین الٰہی یا شریعت فطریہ کے لباس میں جلوہ گر ہوئی اور جس پر بشریت کی فطری اساس و بنیاد تھی اس کا مرجع شیخ المرسلین حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی بنی اور اس سلسلے میں انبیائے کرام کی بعثت کا جو بھی انداز رہا ہو لیکن حضرت ابوالبشر کے بعد حضرت نوحؑ صاحب مرتبت نبی ہوئے اور خود وحی الٰہی نے حضرت نوحؑ کی دعوت اصلاح و عمل کا خاص طور پر ذکر فرما کر یہ بات واضح کر دی کہ آدمؑ کی اولاد میں حضرت نوحؑ صاحب عزیمت و مرتبت اور معلم حق و صداقت ہوئے اور ان کی تمام تر تعلیم یہی رہی کہ مظاہر پرستی اور اصنام پرستی سے کلی طور پر کنارہ کشی اختیار کی جائے اور خالص توحید الٰہی اور حکم خداوندی کی راہ نجات و عمل پر توبہ و انابت کی پونجی کے ساتھ رجوع کرنے کی صلاحیت اجاگر کی جائے۔ ظاہر ہے کہ توحید خداوندی کا یہ سبق جو اول دن سے دہرایا جا رہا ہے اصل دین الٰہی یا دین فطرت

ہی ہے۔ قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کی اس دعوت وتبلیغ کا متعدد مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے جس سے حضرت نوح کی دعوت اور ان کی قوم کی مظاہر پرستی وگمرہی سامنے آتی ہے۔ سورۂ نوح میں دعوت نوح کے مختلف عنوانات مجمل طور پر پیش کئے گئے ہیں:

انا ارسلنا نوحاً الیٰ قومه ان انذر قومک من قبل ان یاتیهم عذاب الیم۔

(نوحؑ کو خلعت رسالت سے سرفراز کر کے ان کی قوم کی طرف ہم نے بھیجا کہ اس سے پہلے کہ ان کی نافرمانیوں اور غلط روی کی سرزنش میں ان پر دردناک عذاب آئے۔ ان کو سرکشی وگمرہی کے نتائج سے ڈراؤ)

ظاہر ہے کہ حضرت نوح کی قوم وہی تھی جو ابتدائے آفرینش کی کج رویوں میں صراط مستقیم سے بھٹک کر مظاہر پرستی کی لعنتوں میں گرفتار ہوگئی تھی اور خالص خدا پرستی کا شعار جو ان کے فطری وجدان سے متعلق تھا ان کی غافل وجاہل آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا، پس حضرت نوحؑ کی دعوت اسی دین الٰہی کی طرف تھی جس پر نوع انسانی کی فوز وفلاح اور ہدایت وسعادت کا انحصار تھا۔ پس نوح نے قوم کو پکارا اور قبول حق کی دعوت دی:

قال یا قوم انی لکم نذیر مبین ان اعبدوالله و اتقوه واطیعون یغفرلکم من ذنوبکم ویوخرکم الیٰ اجل مسمی الخ

(اے لوگو میں تمہیں تمہاری سرکشی وگمرہی کے نتائج سے صاف صاف طور پر ڈرانے والا ہوں۔ ان باطل پرستوں سے باز آجاؤ اور خدائے واحد کی عبادت اختیار کرو اور اس کی گرفت کے دردناک نتائج سے ڈرو، کیونکہ وہ بڑی قوت وقدرت والا ہے اور میں جو کچھ تم سے اس بارے میں کہتا ہوں اس پر سچے دل سے میری اطاعت کرو۔ اگر تم نے میری دعوت حق کو قبول کرلیا تو وہ خدائے بزرگ وبرتر تمہاری پچھلی نافرمانیوں کو معاف کردے گا۔ اور تمہیں

وقت مقررہ تک جینے کی مہلت عطا فرمائے گا)

لیکن جیسے جیسے حضرت نوح کی دعوت حق و صداقت اور دین الٰہی کی تبلیغی جدو جہد کی رفتار تیز ہوتی گئی ان کی قوم کی سرکشی بڑھتی گئی اور نافرمانوں کے غرور نفس نے بدبختی کی ہر راہ اختیار کی اور نتیجتاً وہی ہوا جو لوح محفوظ میں پہلے سے درج کیا جا چکا تھا۔ یعنی حضرت نوحؑ نے بارگاہ احدیت میں مجبور و تنگ آ کر ان کے حق میں عذاب کی دعا فرمائی کیونکہ اس کے سوا اور کوئی دوسری راہ نہیں تھی۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کو قرآن کریم میں حسب ذیل الفاظ میں پیش فرمایا گیا ہے:

وقال نوح رب لاتذر علی الارض من الکافرین الخ

(اور نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب! (برائی سے) ڈرانے اور (نیکی کی) تبلیغ کی مہلت ختم ہو چکی۔ بس اب سرکشوں کو زمین پر پھلنے پھولنے کے لئے نہ چھوڑ اور اگر تو نے ان کو ان کے اس حال پر چھوڑ دیا تو یہ سرکش تیرے پرستاروں کو گمراہ کر ڈالیں گے)

اسی طرح حضرت ادریسؑ بھی صاحب دعوت نبی ہوئے مگر آپ کو بھی قوم کی نافرمانی سے عاجز ہو کر کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی۔ گویا تمام انبیاء مرسلین، مصلحین اور معلمین حق و صداقت چاہے وہ جس مسلک و قوم میں مبعوث ہوئے ہوں اور خواہ انہوں نے کتنی ہی مدت تک کافروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہو مگر سب کی دعوت و تبلیغ کا مرکز وہی مرکزِ توحید رہا جس کی دولت خود حضرت سیدنا ابراہیمؑ کو بھی عطا فرمائی گئی۔ قرآن کریم نے صاف صاف ان حقائق کو بیان فرما کر عالمگیر دین الٰہی یا شریعت فطریہ کے تدریجی مدارج اور تبلیغی و ارتقائی جدو جہد کی کامل ترین تصویر پیش فرما دی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح و النبیین من بعدہ و اوحینا الیٰ ابراھیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب و الاسباط و عیسیٰ و ایوب و

یونس و هارون و سلیمان و آتینا داؤد زبوراً و رسلاً قد قصصنهم علیک من قبل و رسلالم نقصصم علیک و کلم الله موسیٰ تکلیما.

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تحقیق کہ آپ پر ہم نے اسی طرح وحی کی ہے جس طرح کہ آپ سے پہلے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر کی گئی تھی اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور ان کے فرزندوں پر وحی نازل کی تھی اور عیسیٰؑ وایوب اور یونسؑ و ہارون وسلیمان پر بھی ہم نے وحی اتاری اور داؤدؑ کو ہم نے زبور بھی دی تھی اور ان کے علاوہ (یعنی) وہ مرسلین جن کا حال ہم نے تم پر ظاہر کیا اور وہ (بہت سارے مرسلین ایسے بھی ہیں) جن کا مفصل حال ہم نے تم کو نہیں سنایا اور (سلسلہ وحی کی ایک اور صورت یہ بھی تھی کہ) اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا چاہئے)

یعنی وحی الٰہی نے اس آیت مقدسہ میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ:

سنته الله التی قدخلت من قبل. ولن تجدلسنته الله تبدیلا

(اللہ کی سنت وہی ہے جو قبل سے یعنی حضرت ابوالبشر سیدنا آدم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک مختلف وقتوں اور مختلف لباسوں میں جلوہ ریز ہوتی رہی ہے اور ہرگز اس میں تم کوئی تغیر وتبدل نہیں پاؤ گے) کیونکہ حضرت آدم کو علم الاسماء اور فتلقّی آدمؑ من رّبہ کلمٰت کی جو حقیقت القاء کی گئی تھی وہ وہی تھی جو حضرت نوحؑ کے لباس میں بہ شکل وحی و دعوت نمودار ہوئی اور حضرت ادریسؑ کے رنگ وروپ میں وہی دعوت حق وصداقت یا تبلیغ دین فطرت ظاہر ہوئی اور قرآن کریم نے دراصل دین حق اور شریعت فطریہ کی اسی وحدت و یکسانیت کا مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اظہار فرمایا ہے کہ گولباس واوقات مختلف رہے ہیں مگر حقیقت دعوت میں پوری وحدت رہی ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھوں وہی دعوت دین فطرت ملت ابراہیمی کے لباس میں جلوہ فرما ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد تمام انبیاء ومرسلین کا مرجع ومرکز وہی نقطہ

ہدایت وسعادت تھا جسے وحی الٰہی نے ملت ابراہیمی کے نام سے تعبیر فرمایا ہے اور جس حقیقت کا قرآن کریم نے سورۂ الانعام میں مکرر اعادہ فرمایا ہے:

ومن ذریته داؤد و سلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و هارون و کذلک نجزی المحسنین و ذکریا و یحییٰ و عیسیٰ و الیاس کل من الصالحین و اسمٰعیل و الیسع و یونس و لوطاً و کلا فضلنا علی العلمین. ومن ابائهم و ذریاتهم اخوانهم واجتبینهم وهدینهم الی صراط مستقیم.

(اور ابراہیمؑ کی ذریت میں سے داؤد وسلیمان اور ایوب و یوسف اور موسیٰ وہارون سب کے سب ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہم محسنین کو بدلہ دیتے ہیں، ونیز ذکریا یحییٰ عیسیٰ الیاس یہ سب حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں ہیں اور ان میں سے ہر نبی کا شمار اللہ کے نزدیک صالحین میں ہے اور اسمٰعیل، الیسع، یونس، لوط ان تمام لوگوں کو ہم نے تمام عالم پر فضیلت دی۔ اور جو نیکوکار ان کی ذریات میں سے ان کے بھائیوں میں سے ہوئے ہیں ان کو ہم نے برگزیدہ کیا ہے اور ہدایت دی ہے صراط مستقیم کی۔)

غرض یہ تمام انبیائے مذکورین وغیر مذکورین جو یا تو ذریت ابراہیم میں داخل ہیں یا ان کے اخوان میں شامل ہیں۔ ظہور و بعثت ابراہیمؑ سے بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک کا یہ سارا سلسلہ نبوت و رسالت اور اہتمام دعوت و ارشاد کلی طور پر نقطہ توحید اور انابت الی اللہ پر مرکوز رہا اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد تمام اولوالعزم انبیائے کرام نے اور بالخصوص حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اسی دین حق یا ملت و دین ابراہیمی کے اعلاء و تبلیغ کو اپنا کر اپنی اپنی قوم کو راہ حق و صداقت اور صراط مستقیم پر بلایا اور یہی وجہ ہے کہ ہر حلقے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیمؑ ہم میں سے تھے۔

لیکن قرآن کریم نسل ونسب کی بنیاد پر کئے گئے ایسے دعاوی کی تردید فرما کر یہ

حقیقت بھی پیش فرماتا ہے کہ دراصل حضرت ابراہیمؑ اللہ کے مخلص ترین پرستار تھے اور دین حق کے مبلغ تھے جو ساری نوع انسانی کی فوز وفلاح کا داعی اور ضامن ہے۔!

ملت ابراہیمی اور دین حق:

قرآن کریم اس ملت ابراہیمی یا دین حق کو بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر تتمہ وتکملہ بنا کر اسے "الاسلام" کے نام سے تعبیر فرماتا ہے:

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الاخرة من الخاسرین.

(اور کون ایسا ناعاقبت اندیش ہے جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین پسند کرے اور اگر کوئی اس سے سرتابی کر کے کوئی غلط دین اختیار کرے تو ہرگز ہرگز اللہ کی بارگاہ میں اس کا وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ باطل شعار آخرت کی زندگی میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا)

اور یہ وہی اسلام ہے جس کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ احدیت میں یہ درخواست پیش فرمائی تھی کہ:

ربنا واجعلنا مسلمین لک. ومن ذریتنا امته مسلمته لک

(اے میرے رب بنا مجھے اور اسمٰعیل کو اپنا سچا فرماں بردار (مسلمان) و نیز ہماری ذریت میں سے ایک ایسی امت جو صرف تیری فرماں بردار (امت مسلمہ) ہو)

لہٰذا عرض یہ ہے کہ توحید الٰہی کا یہ اعلیٰ ترین تخیل حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت عیسیٰ تک ادوار بہ ادوار سفر کرتا ہوا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نوع انسانی کے سامنے حرف آخر کی صورت اسلام یا دین قیم بن کر نمودار ہوا اور اس لئے وحی الٰہی نے اسے دین حق سے تعبیر فرمایا:

ان الدین عند الله الاسلام

(دین تو بس اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)

مگر اس شریعت الٰہیہ، تبلیغ و دعوت کی اصل و اساس یا بہ الفاظ دگر قرآن کریم کے الفاظ میں ''الہدیٰ'' کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تک بنو اسرائیل نے زیادہ تر دغا ہی کی۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میمنت کے بعد کسی معلم حق و صداقت کی دعوت صالحہ کو قبول عام کا درجہ نہ دینے میں جس انحراف و سرکشی کا ثبوت دیا گیا اور انبیائے کرام کی تبلیغی جدوجہد کی راہ میں جو مزاحمتیں پیدا کی گئیں ان کی انسانیت کش مہلک پردازیوں نے نوع انسانی کے ہر گوشہ حیات اور دائرۂ عمل کو مسموم و معطل کر ڈالا تھا اور خدا کی ساری زمین غیر خدا کی باطل پرستاریوں کی آلودگیوں سے گندگیوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی ان ذمائم کے عہد عروج میں جو ظہور اسلام کے پہلے پہلے دنیا کو جہنم زار شقاوت بنائے ہوئے تھے، عالم انسانیت کی فطری طور پر یہ مانگ تھی کہ اصلاح و نجات کی کوئی ایسی روشنی نمودار ہو جو ساری نوع انسانی کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو، کاروان حیات کی منزل مقصود سے یک سرگم گشتگی نے تشنگان ہدایت و سعادت کو سراپا انتظار بنا رکھا تھا کیونکہ کچلی ہوئی انسانیت کے مجروح تقاضوں میں ابھی انگڑائیاں باقی تھیں اور دین فطرت کی کامل ترین معجز نمائیوں کا اور کرشمہ باریوں کا مناسب ترین وقت بھی یہی تھا۔ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی دعوات صالحہ و تعلیمات الٰہیہ کے جو نقوش و آثار باقی تھے ان میں تکمیلی نشو و نما کے تمام دروازے حاملین تورات و انجیل کی غلط تعبیر و تاویل سے بند ہو چکے تھے اور نصرانیت و یہودیت کی آپس کی چشمکوں سے ملت ابراہیمی یا دین حق کا اکمل ترین تخیل معرض ظہور میں نہ آ سکا اور اس بارے میں طرح طرح کی موشگافیوں نے خالص خدا پرستی یا توحید الٰہی کے پروان چڑھنے میں چند در چند غلط کارانہ شقیں پیدا کر دیں پس اسلام تمام مذاہب ماضیہ (یا شریعت الٰہی اور ملت ابراہیمی)

کا تکملہ و مجموعہ بن کر وادی ام القری میں بنو ہاشم کے یتیم شہزادے کے قدوسی لباس میں بہ ہزار تمکنت مبعوث ہوا اور دیکھتے دیکھتے نوع انسانی کے اعمال و کردار پر حاوی ہوگیا۔

ویسے مذاہب عالم کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے وہ باقیات الصالحات کی حیثیت سے ہمارا بڑا سرمایہ ہے اور اس کو نظر انداز کر کے ہم اسلام کی بنیادی فکر پر کوئی قابل قدر روشنی ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ جس عالمگیر فکر کو اسلام کی بنیادی فکر کہا جاتا ہے اس کا جزئی اندوختہ میری منزل مقصود کا پہلا نقش قدم ہے اور اسی نشان پر دریافت منزل کے گونا گوں سوالات خود بخود حل ہوتے نظر آتے ہیں۔

دراصل دین حق کے بنیادی فکر کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اس دنیا کی تاریخ۔ اس نقطہ سے غیر متعلق ہو کر اگر ہم اسلام کے اساسی فکر پر سوچنے لگیں تو دین فطرت کے تدریجی و ارتقائی مدارج یکسر نظروں سے اوجھل ہو کر رہ جائیں گے جو بمنزلہ اجزاء کے ہیں۔

مطلب یہ کہ ماضی میں فکر و نظر کی ہزار کم بینی و کم فہمی شامل حال رہی ہو لیکن ایک بات بالکل اٹل ہے کہ اسلامیان عالم کے پاس جب تک کتاب اللہ اور اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال برکت و صداقت موجود ہے اس وقت تک ملت ابراہیمی کی صداقت آثار تاریخ اور دین فطرت کی ممتاز حیثیات قدرت کے ہاتھوں محفوظ ہیں اور بغیر کسی تبصرہ و تحقیق کے اسلام کے تمام مدارج اور اس کے مختلف ادوار و ملل میں انمٹ نقوش و آثار ناقابل محو ہیں۔

کیونکہ ظہور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی تاریخ میں حرف اول و آخر کی صداقت کا مالک ہے خود اس کی صداقتیں ہی الٰہیات و دینیات ہیں۔ اور وہ جو اول و آخر میں اور درمیان میں کچھ مدارج پائے جاتے ہیں ان کا درجہ اس کے ضمنی و تدریجی مراتب سے متعلق ہے۔ روز اول سے یہی فکر مختلف گہواروں میں مختلف رنگ و بو اختیار کرتا ہوا تکمیلیت و عروج

کی منزل پر پہنچ کر حرف آخر اور دین کامل کے لباس میں جلوہ فرما ہوا۔

اسلام ہی دین حق ہے:

مذاہب عالم کی تاریخ کا ہر (غیر مخلوط) ورق ایک خدا کی پرستاری اور اتقا و نکوکاری کی تحصیل و تکمیل کی برکتوں سے مملو ہے، ہر داعی الی الحق نے نوع انسانی کو خالص خدا پرستی کی ہی دعوت دی ہے اور ملت ابراہیمی کی بنیادی فکر بھی یہی ہے مگر اس یک رنگی و یکسانیت کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئے ہوئے الٰہی پیغامات اور دیگر انبیاء پر نازل فرمائے جانے والے پیغامات الٰہی کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال والاکرام نے یہ اعلان صرف حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص رکھا کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی

(آج میں نے آپؐ پر آپ کا دین مکمل کر دیا اور اپنی ساری نعمتیں آپؐ پر تمام کر دیں)

یعنی انعامات الٰہی کا جو سلسلہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کی ذات گرامی سے شروع ہوا وہ افضل البشر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا۔

قرآن کی اس بشارت کو اگر تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ ایک خدا کا تصور تو یقیناً ہر نبی نے پیش کیا لیکن اس کی خدائی کا کامل ترین تصور اور ایک مکمل الٰہی نظام کی نعمت وہی ''نعمت اتم'' ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اتممت علیکم نعمتی۔

امم ماضیہ میں ہر چند کہ خدا کا تصور موجود تھا مگر سوا ان چند قدسی نفوس کے جو وحی و رسالت کے حامل تھے۔ ساری کی ساری نوع انسانی غیر خدا کی پرستش میں گم تھی اور خدا کے وجود کا تصور تو تھا لیکن اس کی خدائی کا ہر ذرہ اس کے حیط قدرت و اختیار سے باہر سمجھا جا رہا تھا۔

اسلام نے سب سے زیادہ اسی طاغوت اکبر کی نفی کی اور ایک ایسے خدا کے اثبات واقرار کا گراں مایہ تخیل پیش کیا جو کائنات وجود کے ہر گوشے پر اور عالم انسانی کے ہر پہلو پر ایک مکمل ترین قوت وقدرت کے ساتھ خدائی کرنے والے حیَّ وقائم اور رحیم وعزیز خدا کے تصور پر مشتمل ہے۔

اور اس کلی تصور توحید سے اعراض کو اسلام نے شرک کہہ کر اس راہ میں نمایاں ہونے والے مفاسد کے تمام دروازوں کا کلی انسداد کر دیا اس انقلابی فکر کے سبب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ بے راہ روی کی ہزار صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن اسلام کے اصل و اساس میں کوئی غلط روی ممکن نہیں پس اسلام کا یہ اعلیٰ ترین تخیل کہ توحید فی الذات کے ساتھ ساتھ توحید فی الصفات کا تصور اور شرک فی الذات کے ساتھ شرک فی الصفات کا نظریہ اسلام کی وہ بنیادی فکر ہے جو محمدی اسلام اور غیر محمدی اسلام کے درمیان حد فاصل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

اور یہی اساسی فکر حضرت ابراہیمؑ کے لباس میں ملبوس ہو کر بابل و نینوا کا روحانی فلسفہ بنا اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ کے خرقہ وعبا میں یہودیت وعیسائیت کے مبلغ کی شکل میں نمودار ہوا اور بالآخر اول وآخر بن کر، اول وآخر ذات قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم میں، اسلام اور ملت ابراہیمی اور دین فطرت کی ازلی صداقتوں میں، وادی ام القریٰ کے گہوارہ برکت وصداقت میں اور نجات دہندۂ نوع انسانی کے روپ میں داعی الی الحق والا سلام بن کر ظاہر ہوا۔ و صلی اللہ علیہ و علی ابیہ سیدنا ابراھیمؑ و اسمٰعیلؑ و علی عباداللہ الصالحین و علی اصحابہ و عترتہ اجمعین۔

حضرت مولانا انوارالحق شہودی

(نازش سہسرامی)

کی

تصنیفات

★ حرفِ تمنا (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۸۳ء

★ وحدتِ الہٰ (توحید پر ایک گفتگو) ۱۹۸۴ء

★ حریمِ شوق (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۸۶ء

★ شرفِ آدم کا نقطۂ عروج (مذہبی فکر کا فلسفیانہ اظہار) ۱۹۸۷ء

★ تصوف و رہبانیت ایک مطالعہ (تصوف پر ایک جامع گفتگو) ۱۹۹۹ء

★ اسلام کا روحانی نظام (عبادت نبوی کے پس منظر میں) ۲۰۰۲ء

★ فوز و فلاح کی گمشدہ کڑی (جدوجہدِ نبوی کے پس منظر میں) ۲۰۰۷ء

تشنۂ طباعت

★ قطعاتِ نازش (کچھ منتخب قطعات کا مجموعہ)

★ منظوماتِ نازش (نظموں کا انتخاب)

★ تلاشِ منزل (مجموعہ مضامین)

★ تذکرہ بزرگانِ چشت (فخری بزرگوں کا تذکرہ)

رابطہ

قاضی علی حق اکیڈمی، دائرہ حضرت وصی شاہ ہارون، سہسرام

مولانا انوارالحق لائبریری، نیو کریم گنج، گیا

اِرم پبلیشنگ ہاوس، دریاپور، پٹنہ۔۴

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

FOUZ-O-FLAH KI GUMSHUDA KADI

By

Hazrat Moulana Anwarul Haque Shohoodi

Quazi Ali Haque Academy
Daira Hazrat Wasi, Shah Haroon, Sasaram- 821115